BNHS301DET

عہد وسطیٰ کا یورپ

Medieval Europe

بی۔اے۔(آنرس)

چار سالہ پروگرام

تیسرا سمسٹر (تاریخ)

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

Copyright © 2026, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN : 978-81-687130-5-5
Course : Medieval Europe
First Edition : July 2026
Copies : 3500
Price : 85/- (The price of the book is included in admission fee of distance mode students)

Course Coordinator

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**, Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Editorial Board/Editors

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**
Associate Professor (History), CDOE, MANUU

Dr Syed Meer Abul Hussain
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Mr Mohd Aasim
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU

Dr Ikramul Haque
Asst. Professor, Dept. of History, MANUU

Dr Zeyaul Haque
Asst. Professor, CAS, Dept. of History, AMU

Dr Daud Ibrahim
Asst. Prof. (Cont.), Dept. of History, MANUU

Dr Khursheed Ahmad Bhatt
Asst. Prof. of History (Cont.) Lucknow Campus, MANUU

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Dept. of History & Culture, JMI

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Dept. of History, MANUU

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies, Dept. of History, AMU

Prof. Danish Moin
Dept. of History, MANUU

Prof. Alauddin Khan
Head, Dept. of History, Shibli National College

Dr Samana Zafar
Associate Professor, Dept. of Woman Studies, MANUU

Mr Mohd Aasim
Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU
(Language Editor)

Production

Prof. Nikhath Jahan
Professor (Urdu),
CDOE, MANUU

Mr P Habibulla
Assistant Registrar, Purchase
& Stores Section, MANUU

Dr Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (Cont.),
CDOE, MANUU

Mohd Abdul Naseer
Section Officer, CDOE, MANUU

Shaik Ismail
UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC
Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by **Mr. Mohd Aasim**, Faculty of History, CDOE, MANUU
Printed at Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

فہرست

پیغام		وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام		ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈی نیٹر (تاریخ)	7
اکائی نمبر	**اکائی کا نام**	**مصنف**	**صفحہ نمبر**
بلاک I	**سیاسی تبدیلیوں کی تفہیم**		
1	یورپ میں عہد وسطیٰ کی تفہیم: قدیم سے جدید دور میں منتقلی	ڈاکٹر منصور احمد صدیقی	9
2	مغربی یورپ میں جاگیرداری نظام	پروفیسر پرویز نظیر	25
3	عہد وسطیٰ کے یورپ میں ریاست اور کلیسا	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	40
بلاک II	**معاشی، مذہبی اور ثقافتی تبدیلیوں کی تفہیم**		
4	گیارہویں سے چودھویں صدی کے دوران یورپی سماج اور معیشت	محمد عاصم	52
5	مذہبی تحریکیں: صلیبی جنگیں اور یورپی سماج پر ان کے اثر	ڈاکٹر منصور احمد صدیقی	65
6	نشاۃ ثانیہ کی ابتدا	ڈاکٹر منصور احمد صدیقی	82
	تجویز کردہ اکتسابی مواد		96
	نمونہ امتحانی پرچہ		98

مصنفین کی تفصیلات

(Writers' Details)

Dr. Mansoor Ahmad Siddiqui Asst. Prof., Dept. of Ancient History and Culture, Gandhi Faiz-E-Aam (P.G.) College, Shahjahanpur	**ڈاکٹر منصور احمد صدیقی**، شعبہ قدیم تاریخ وثقافت، گاندھی فیض عام کالج، شاہجہانپور
Prof. Perwez Nazir Centre for Advanced Studies, Dept. of History, AMU	**پروفیسر پرویز نظیر**، سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ،
Dr Syed Meer Abul Hussain Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**ڈاکٹر سید میر ابوالحسین**، سی ڈی اوای، مانو، حیدرآباد
Mr Mohd Aasim Asst. Prof. of History (Cont.), CDOE, MANUU	**جناب محمد عاصم**، سی ڈی اوای، مانو، حیدرآباد

پروف ریڈرس (Proof Readers)

اول : محمد عاصم

دوم : سید میر ابوالحسین

فائنل : شیخ محبوب باشا

ٹائٹل پیج(Title Page): ابراہیم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU)، 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ A+ حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری/گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعہ کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات واطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہوگا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم وتدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلامعاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو/ہندی/انگریزی/عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والے عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا گیا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیے جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2025-2026 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدر آباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جارہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب۔ کورس 'عہد وسطیٰ کا یورپ' میں خوش آمدید۔۔ این ای پی-2020 کے تقاضوں کے مطابق تاریخ کے مضمون پر یہ خود اکتسابی مواد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیم کے ان طلبا کے لیے تیار کیا گیا ہے جو چار سالہ یو جی پروگرام کے سمسٹر سوم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس میں، آپ یورپ کی قدیم دور سے عہد وسطیٰ کے دور میں منتقلی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا مطالعہ کریں گے۔ آپ مغربی یورپ میں جاگیرداری نظام (Feudalism) کے عروج اور عہد وسطیٰ کے یورپ میں ریاست اور کلیسا کے درمیان پیچیدہ تعلقات کو سمجھیں گے۔ آپ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ، گیارہویں سے چودھویں صدی کے درمیان یورپی سماج اور معیشت میں ہونے والی ترقی، اور مذہبی تحریک کے نتیجے میں ہونے والی صلیبی جنگوں (Crusades) کے یورپی سماج اور عالمی تاریخ پر دیرپا اثرات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ یہ کورس آپ کو یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے ابتدائی محرکات اور ان ثقافتی و مذہبی تبدیلیوں کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا جنھوں نے انسانی تہذیب پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں / بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

عہد وسطیٰ کا یورپ

Medieval Europe

اکائی 1۔یوروپ کے عہدِ وسطیٰ کی تفہیم: دورِ قدیم سے دورِ وسطیٰ میں منتقلی

(Understanding the Middle Ages in Europe: Transition from Ancient to Medieval)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 پس منظر

1.3 سلطنت روما کی تقسیم وزوال

1.3.1 زوال کے اسباب

1.3.2 زوال کے بعد سلطنت کی سیاسی صورتحال

1.3.3 وسی گاتھ ریاست

1.3.4 ریاست برگنڈی

1.3.5 ونڈال ریاست

1.3.6 ریاست لومبارڈ

1.3.7 انگلینڈ کی اینگلو سیکسن ریاستیں

1.4 عہدِ وسطیٰ کا آغاز اور عیسائی مذہب

1.4.1 نئے دور کے آغاز میں یوروپی سماج

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 کلیدی الفاظ

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.0 تمہید (Introduction)

عام طور پر پانچویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک کا دور یوروپ میں عہدِ وسطیٰ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مختلف یوروپی دانشوروں نے سترھویں صدی میں یوروپ کے کلاسیکی دور اور نشاۃ ثانیہ کے درمیانی وقفہ کو 'عہدِ وسطیٰ' کا نام دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ مدت جابرانہ فتوحات، جہالت اور توہم پرستی پر مبنی تھی۔ ان کے اس زاویہ نظر میں کتنی حقیقت ہے، یہ ایک بحث طلب موضوع ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس دور میں سیاسی، سماجی اور مذہبی جہتوں میں بہت سی ایسی واضح تبدیلیاں واقع ہوئیں جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ 476ء میں مغربی رومی سلطنت کا زوال اور جاگیر دارانہ نظام کا آغاز ان میں نمایاں ہیں۔ ساتویں صدی میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور اسلام کی اشاعت کے ساتھ عربوں کو جو سیاسی قوت حاصل ہوئی اس نے دو بڑے مذاہب عیسائیت اور اسلام کے پیروکاروں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر دیا، جس کا نتیجہ صلیبی جنگوں (crusade) کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان جنگوں نے یوروپ کے معاشی ڈھانچہ کو بھی متاثر کیا اور صنعت و تجارت میں اضافہ کیا۔ کیتھولک چرچ اور پوپ، سیاسی و سماجی دونوں میدانوں میں زبردست اثر و رسوخ کا حامل تھے۔ مرکزی سیاسی قوت کا فقدان اور جاگیرداروں کا سماج پر اقتدار اس دور کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ وہ دور جس میں یوروپ کا قدیم عہد، عہدِ وسطیٰ میں داخل ہو رہا تھا، تاریخ میں اواخر عہد قدیم (Late Antiquity) کہلاتا ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- ان عوامل کو سمجھ سکیں جو یوروپ میں عہدِ وسطیٰ کے آغاز کا سبب بنے۔
- اس دور میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اثرات کو سمجھ سکیں۔
- عہدِ وسطیٰ کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی خصوصیات کو واضح کر سکیں۔
- قدیم اور جدید ادوار کی اس درمیانی مدت کی عبورت حیثیت کا تجزیہ کر سکیں۔

1.2 پس منظر

یوروپ میں سلطنت روما کی طاقت اور اقتدار قبل مسیح کی صدیوں میں ہی اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ جولیس سیزر جیسے شہنشاہوں نے ایک وسیع علاقے پر اپنا تسلط قائم کر کے ایک عظیم حکمرانی کے عہد کا آغاز کر دیا تھا، جو بتدریج مزید قوت حاصل کرتا رہا۔ شہنشاہ کانسٹنٹائن (Constantine) نے 330 عیسوی میں بحر اسود کے کنارے قسطنطنیہ (Constantinople) کے نام سے اپنا دوسرا دارالسلطنت قائم کیا، جس کے بعد رومی سلطنت مغربی اور مشرقی دو حصوں میں تقسیم ہونا شروع ہو گئی۔ قسطنطنیہ میں رہ کر شہنشاہ کے لیے مغربی حصوں پر کنٹرول رکھنا مشکل تھا۔ چنانچہ یہی ہوا اور آخر کار 476 عیسوی میں مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن مشرقی سلطنت جسے بازنطینی سلطنت بھی کہا جاتا ہے، اگلے لگ بھگ ایک ہزار سال تک قائم رہی یہاں تک کہ 1453ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ پورا دور

یوروپ میں عہدِ وسطیٰ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔اس دور میں کیتھولک کلیسا اور مذہبی پیشواؤں کا اثر ورسوخ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سیاسی میدان میں بھی مرکزی قوت کے بجائے جاگیر دارانہ طرز پر قائم اقتدار اس دور کی واضح خصوصیت ہے، جس کے نقوش یوروپی تہذیب و تمدن پر بہ آسانی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ کلیسا اور ریاست میں رسہ کشی پورے دور میں ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل عیسائی مونسٹیریز تیسری صدی عیسوی سے چھٹی عیسوی صدی کے درمیان میں نمایاں ہونا شروع ہوئیں۔ان کے وجود نے ہی اس سیاست قوت اور تصادم کو جنم دیا جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے۔اسی دور میں اسلام اور مسلمانوں کے دروج نے بھی یوروپ پر اثر ڈالا۔ مسلم حکمرانوں کی فتوحات نے ایشیاء اور آفریقہ ہی نہیں یوروپ کے دور دروازوں پر بھی دستک دے ڈالی۔ یروشلم کی سرزمین جو مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے یکساں طور پر مقدس تھی، صلیبی جنگوں کا اہم سبب تھی۔ان صلیبی جنگ کے اثرات یوروپ کے عہدِ وسطیٰ پر نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ غرض پانچویں صدی عیسوی سے ہی یوروپ میں ان اہم تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا تھا جنہوں نے براعظم کو ایک نئے دور میں داخل کیا۔

1.3 سلطنت روما کی تقسیم وزوال

753ء میں بحیرہ روم (Mediterranean) میں مل جانے والی ندی ٹائیبر (Tiber) کے دہانہ شہر روم کا بسنا قدیم تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ گو کہ اس کا آغاز کاروباری اہمیت کا حامل تھا، لیکن بتدریج اس نے سیاسی اہمیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ دوسری صدی قبل مسیح تک سسلی، اسپین اور یونان تک روم کی طاقت پہنچ گئی۔ رومی سلطنتی کی وسعت اور اس کے اقتدار نے یوروپ کی سیاسی صورتحال تبدیل کر دی۔ پہلی صدی عیسوی میں جولیس سیزر نے نہ صرف فرانس کو فتح کر لیا بلکہ وہ برطانیہ تک پہنچ گیا۔ تاہم پہلی صدی عیسوی میں اگسٹس اعظم (27ق م تا14ء) اصل میں پہلا رومی شہنشاہ تھا۔اس کے بعد ٹائیبریس (14تا37ء)، کیلیگلا (Caligula) (37تا41ء) اور کلاؤڈیس (Claudius) (41تا54ء) کا دورِ اقتدار رومی سلطنت کے لیے امن و سلامتی کا رہا۔ 54 عیسوی سے 68 عیسوی تک نیرو (Nero) نے حکومت سنبھالی جس کی حکومت کا خاتمہ اس کی خودکشی سے ہوا۔اس کے بعد سے 180ء میں مارکس اوریلیس (Marcus Aurelius) کی وفات تک سلطنت روما ایک مضبوط، خوشحال اور وسیع ریاست بن چکی تھی، جس کا دائرہ اقتدار میں نہ صرف یوروپ کا زیادہ تر حصہ شامل تھا بلکہ ایشیائے کوچک اور افریقہ کا شمالی ساحلی علاقہ بھی اس کے زیر نگیں تھا۔ مختلف نشیب و فراز سے گزر کر ڈائیوکلیٹین (Diocletian) (284تا305) کے دورِ حکومت میں یہ عظیم الشان سلطنت مشرقی اور مغربی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔306ء میں شہنشاہ کانسٹنٹائن (306-331) کا اقتدار سیاسی و سماجی اعتبار سے سلطنت کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ –

شہنشاہ کانسٹنٹائن کے دو اقدام بہت اہم ہیں۔ پہلا عیسائیت کے تئیں نرمی اور قبولیت کا رویہ جو اس نے 313ء میں میلان کے اعلامیہ کے ذریعہ ظاہر کیا۔ دراصل اس وقت تک عیسائیت سلطنت میں اپنے قدم اچھی طرح جما چکی تھی۔ دھیرے دھیرے بہت سے فرقے اسے قبول کرتے جا رہے تھے۔ کانسٹنٹائن نے محسوس کر لیا کہ ریاست کے امن اور سماجی فلاح کے لیے اسے قبول کر لینا چاہیے۔اس نے ایسا ہی کیا، چنانچہ وہ تاریخ میں روم کے پہلے عیسائی حکمراں کے طور پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہا۔اس کے اس فیصلے نے سماجی و مذہبی اثرات تو

چھوڑے، ساتھ ہی سیاسی زاویہ نظر سے بھی اپنی اہمیت کو تسلیم کرلیا۔ اس کا دوسرا قدم بھی کم اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اس نے 330 عیسوی صدی میں بحر اسود کے ساحل پر واقع علاقہ 'باز نطئیم' میں دوسرا دارالسلطنت قائم کیا۔ یہ نیا شہر اس کے نام کی نسبت سے کانسپہیہ ٹینپل / قسطنطنیہ (Constantinople) کہلایا۔ قسطنطنیہ کے وجود میں آنے سے سلطنت روم کی مشرقی و مغربی حصوں میں تقسیم کا عمل اور تیز ہو گیا۔ نئی راجدھانی سے سلطنت کے مغربی حصوں پر کنٹرول رکھنا شہنشاہ کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ قسطنطنیہ کی خوشحالی اور پائیداری نے مشرقی حصے کے اقتدار کو ایک لمبے عرصے تک بنائے رکھا، وہیں دوسری جانب مغربی حصے پر گرفت کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ 476ء میں مغربی رومی سلطنت ختم ہو گئی۔ مشرقی سلطنت نے جسے بازنطینی سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ اگلے ایک ہزار سال تک تاریخ میں اپنے وجود کی اہمیت کو درج کرایا۔ یہاں تک کہ 1453ء میں قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہو گیا۔

کانسٹینٹائن اعظم کے بعد تھیوڈوسس اول (395-379ء) آخری عظیم حکمراں تھا جس نے متحدہ (مشرقی و مغربی) سلطنت روما پر حکمرانی کی۔ اس کے دورِ حکومت میں انتظامی صورتحال بھی بہتر تھی اور دفاعی اعتبار سے بھی سلطنت مضبوط رہی۔ لیکن تھیوڈوسیس کے بعد زوال کا عمل تیز ہو گیا۔ کمزور و نااہل حکمراں اور سلطنت کی تقسیم نے حالات دگرگوں کر دیئے۔ وحشی قبائل کے ذریعہ آخری رومی حکمراں رومولس آگسٹولس (Romolus Augustulus) کی 476ء میں معزولی کے ساتھ مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

1.3.1 زوال کے اسباب

آج بھی مورخ اس سلطنت کی شان و شوکت، اس کی عالیشان عمارتیں، خوبصورت شاہراہیں، عمدہ نظم و نسق اور عظیم حکمرانوں کو یاد کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف جب ہم اس کے زوال کا تجزیہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ اسی جاہ حشم میں اس کی تباہی کے نشانات بھی موجود ہیں۔ عوام بالخصوص غلاموں کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ان کے ناگفتہ بہ حالات، کسمپرسی میں گذرتے دن اعلان کرتے ہیں کہ ریاست کی عظمت ان کے کچلے ہوئے ارمانوں سے عبارت ہے۔ ان کی سماجی و معاشی پسماندگی اور نکبت پر ہی سلطنت کی شوکت کے راز پنہاں ہیں۔ کمزور ہوتے ہوئے سیاسی ڈھانچہ نے اندرونی خامیوں اور سماجی ناہمواریوں کو روش کر دیا۔ مغربی رومی سلطنت کے زوال کے اہم اسباب درجِ ذیل ہیں

-

- سلطنت کی غیر معمولی وسعت اس کے زوال کا سبب بنی۔ اتنے بڑے جغرافیائی خطہ پر حکومت کرنا اور نظم و نسق کو قائم کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ یہ مختلف حصوں میں تقسیم ہوتی گئی، جس نے اس کی قوت کو متاثر کیا اور خود حکمرانوں کی طاقت و حیثیت پر بھی اثر پڑا۔
- سلطنت و حکمرانوں دونوں کی قوت کا بڑا انحصار عسکری طاقت پر تھا۔ مضبوط اور بڑی فوج دفاع و بقا دونوں کے لیے ضروری تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی عیسوی تک آتے آتے فوجی تنظیم میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ فوج کے مختلف طبقوں میں مطابقت کی کمی اور عمدہ تربیت کی عدم موجودگی نے پورے فوجی ڈھانچہ کو کمزور کر دیا، جس سے زوال کا راستہ آسان ہو گیا۔
- ہر دور میں کسی بھی ریاست کا استحکام بڑی حد تک اس کی معاشی حیثیت پر منحصر رہا ہے اور معیشت کا دارومدار عوام پر لگائے گئے ٹیکسوں

اوران کی وصولیابی پر ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی مالیاتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے عوام پر ٹیکس بڑھائے گئے جوان کی آمدنی کے تناسب میں زیادہ تھے۔ نتیجتاً اس بوجھ سے عوام پریشانی میں مبتلا ہوئے اور حکومت کے فنڈ میں بھی ضرورت کے مطابق اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس عدام توازن نے سلطنت کی حالت مزید خراب کر دی۔

- عیسائیت کی اشاعت نے بھی رومی سلطنت کی بنیادوں کو نقصان پہنچایا۔ دراصل رومی شہنشاہ نہ صرف مطلع العنان تھے بلکہ الوہی حیثیت کے حامل ہونے کے دعویدار بھی تھے۔ عیسائی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، چنانچہ حکمرانوں کی جانب سے عیسائیت کے پیروکاروں کو دبانے اور کچلنے کے لیے کوششیں کی گئیں، جو بارآور نہ ہو سکیں اور بالآخر شہنشاہ کانسٹینٹائن کو عیسائیت کے تئیں نرم رویہ اختیار کرنا پڑا۔
- زوال میں سب سے اہم کردار جس چیز نے ادا کیا وہ بربر اقوام کے حملے تھے۔ سلطنت کے اندرونی خلفشار اور کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر غیر ملکی بربر اقوام کے مسلسل حملوں نے سب سے زیادہ تباہی پھیلائی اور بالآخر 476ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ مغربی یوروپ پر حملہ آور ان نیم مہذب اقوام میں ہن، گاتھ، ونڈال اور فرینک وغیرہ اہم ہیں۔ درحقیقت چوتھی صدی عیسوی تک گاتھ اور ونڈال بڑی تعداد میں سلطنت میں داخل ہو چکے تھے۔ جرمن و دیگر بربر قومیں رومی سلطنت کا حصہ بن چکی تھیں اور انہیں شہریت کے سبھی حقوق حاصل تھے۔ وہ فوج و دیگر نظم و نسق کے عہدوں پر بھی فائز نظر آتے ہیں۔ اہلِ روم کے معزز خاندانوں میں ان کے ازدواجی رشتے قائم ہو چکے تھے۔ یہ سلطنت کے وفادار تھے۔ بیرونی بربر اقوام کے مقابلے میں یہ زیادہ مہذب تھے اور ان میں ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ رومی سرحد سے باہر جو بربر اقوام تھیں اُن میں آفریقہ کے 'مور'، مغربی ایشیاء میں 'عرب و ایرانی' وسطی ایشیاء کے پٹھار اور کیسپین اسٹیٹ علاقہ کے 'اُرال الٹیک' اور شمال مغربی میں 'جرمن' وسیلٹ کے قومیں قابلِ ذکر تھیں۔

'اُرال الٹیک' گروپ میں سیتھین، میگائر، منگول، ترک، تاتاری، بلغاری اور ہن اقوام شامل تھیں۔ پانچویں صدی میں ان ہی کے مسلسل حملوں نے مغربی رومی سلطنت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ ڈائیکلوٹین (Diocletian) کے دورِ حکومت میں مور، سیرین، عرب اور جرمن اقوام کے افراد بڑی تعداد میں رومی افواج میں شامل ہوئے۔ ان کی تعداد اور اثر و رسوخ بڑھتا ہی رہا یہاں تک کہ کبھی کبھی سرحدوں کے دفاع کی ذمہ داری بھی ان ہی کو سونپ دی جاتی۔ ان قوام کی آمیزش اور عمل دخل سے کئی طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ رومیوں سے ان کے تعلقات کی نوعیت نے بھی سلطنت کے امن و امان پر اثر ڈالا۔ مثلاً 378ء میں رومی افسران کی بدسلوکی سے گاتھ قبیلے کے لوگ بھڑک اُٹھے اور حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایڈریونوپل کی جنگ ہوئی۔ تھیوڈوسیس اپنے زمانے میں مفاہمت کے ذریعہ امن و امان قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ لیکن اسی کے دورِ حکومت میں اسٹیلکو (Stilco) نامی ونڈال قبیلہ کا ایک فوجی سردار بہت طاقتور ہو گیا۔ 395ء میں تھیوڈوسیس کے بعد اس کا بیٹا ہونوریس تخت نشین ہوا، وہ ایک نااہل حکمراں تھا۔ چنانچہ اس نے اسٹیلکو کو پیٹریسیس کا خطاب دیا اور رومی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ یہی نہیں شہنشاہ ہونوریس کی بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی، جس کے نتیجے میں وہ سلطنت کا مختارِ کل ہو گیا۔ اسی طرح ایک دوسرے گاتھ سردار ایلیرک (Alaric) کو بھی تھیوڈوسیس نے دریائے ڈینیوب کی طرف سے سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ

داری دی تھی۔ (ونڈال/ونڈال اور گاتھ) ان دونوں رہنماؤں کے درمیان بالادستی کے لیے حریفانہ چشمک شروع ہوئی اور جلد ہی یہ ایک دوسرے کے زبردست مخالف بن گئے۔ اسٹیلکو کی بڑھتی ہوئی طاقت شہنشاہ ہونوریس کو اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگی اور اس نے سازش کرکے اس کو قتل کرادیا۔ لیکن ایلیرک نے 410ء میں روم پر حملہ کردیا اور تین دن تک شہر کو خوب لوٹا۔ مگر جلد ہی اس کی موت ہوگئی، جس سے حالات مزید بے قابو ہونے سے بچ گئے۔ ہونوریس کی پوزیشن بہت کمزور ہوچکی تھی۔ برطانیہ سے بھی اسے اپنی فوجوں کو واپس بلانا پڑا، جس کے نتیجے میں برطانیہ پر اینگلو سیکسن افراد کا قبضہ ہوگیا۔ گال (فرانس) کے شمالی حصے پر فرینک اور برگنڈین قابض ہوگئے۔ مغربی رومی سلطنت کا دائرہ اختیار سمٹنے لگا۔ ونڈال اسپین میں داخل ہوگئے، لیکن انہیں وہاں سے وسی گاتھوں نے بے دخل کردیا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد ونڈال نے اپنے لیڈر گیسیرک کی قیادت میں آفریقہ میں تریپولی کے مغرب کا پورا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا اور ایک علیحدہ ریاست قائم کرلی۔

دوسری طرف ہن رومی سلطنت کے لیے مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے پے در پے حملے جاری تھے۔ 451ء میں انہوں نے ایک بڑا حملہ اپنے مشہور سپہ سالار اٹیلا کی قیادت میں رومیوں پر کیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس وقت رومی شہنشاہ ویلن ٹینیان کے پاس ایٹیئس جیسا اہل فوجی قائد موجود تھا۔ اُس نے ونڈال کی مدد سے کٹالونیا کی جنگ میں ہن کو شکست فاش دی۔ بعد میں 453ء میں ہن لیڈر اٹیلا کی موت واقع ہوگئی، جس کے بعد رومی سلطنت پر سے ان کا خطرہ ختم ہوگیا، لیکن سلطنت کی اندرونی حالت خانہ جنگی اور افراتفری کا شکار ہوچکی تھی۔ شہنشاہ ویلن ٹینیان سوم نے سپہ سالار ایٹیئس کو قتل کرادیا، جس کے جواب میں اس کے وفاداروں نے خود شہنشاہ کو 455ء میں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ انارکی کا نقطہ عروج تھا۔ فوجی سرداروں اور دیگر اعلیٰ منصب داروں کی بن آئی۔ مختلف گروہ یکے بعد دیگرے کٹھ پتلی حکمرانوں کو تخت نشین کرتے اور بے دخل کرتے رہے۔ اسی درمیان ونڈال راجہ گیسیرک نے بھی روم پر حملہ کردیا۔ سیاسی ڈھانچہ بکھر چکا تھا۔ یہاں تک تکہ 476ء میں آخری رومی (مغربی) شہنشاہ رومولس آگسٹولس کو اس کے سردار اوڈواسیر نے تخت سے اتار دیا اور خود مقتدرِ اعلیٰ بن گیا۔ مگر اب مغربی رومی سلطنت نسبتاً ختم ہوچکی تھی۔ کہنے کو تو متحدہ سلطنت کا ایک ہی شہنشاہ تھا، لیکن واقعتاً مشرقی سلطنت کا اقتدار شہنشاہ جینو کے پاس تھا اور مغربی حصے کی مرکزیت کالعدم ہوگئی تھی اور وہ کئی حصوں میں منقسم ہوگئی تھی۔

1.3.2 زوال کے بعد سلطنت کی سیاسی صورتحال

شہنشاہ رومولس آگسٹولس کے ساتھ مغربی رومی سلطنت کا سقوط عمل میں آگیا۔ اور یہ پورا علاقہ مختلف چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ جن پر ان نیم مہذب اقوام کے افراد نے اپنی حکومت قائم کرلی جو اس کے زوال کا اہم سبب تھے۔ یہ بربر اقوام گذشتہ کافی عرصے سے رومی سلطنت میں قیام پذیر تھیں۔ ان کے افراد نے سیاسی اور سماجی میدان میں اپنی پوزیشن مضبوط کرلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رومی شہنشاہ ہول کا اقتدار کمزور ہونے لگا یہ نااہل حکمراں تخت نشین ہونے گے تو ان اقوام کے سردار اپنی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان ریاستوں کا مختصر جائزہ حسبِ ذیل ہے:

1۔ آسٹروگاتھ ریاست (اٹلی): اوڈواسیر (473-493) جس نے آخری رومی (مغربی) شہنشاہ رومولس آگسٹولس کو بے دخل کرکے اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس طرح اُس کی قیادت میں ونڈال حکومت کا آغاز ہوا۔ اس کے دورِ حکومت کا اہم واقعہ تھیوڈورک کی قیادت میں ڈینیوب

علاقہ کے آسٹرو گاتھ باشندوں کا اٹلی پر حملہ تھا۔ 489ء میں تقریباً دو لاکھ گاتھ کوہ آلپس پار کر کے اٹلی پہنچ گئے۔ تین سال تک اوڈوسنیر کی فوجیں ان سے برسرپیکار رہیں۔ بالآخر 493ء میں اوڈوا سیر قیدی بنالیا گیا اور اس کو قتل کر دیا۔ تھیوڈورک نے پورے اٹلی کا مالک بن گیا۔ 493ء سے 526ء تک کا تھیوڈورک اعظم کا دورِ حکومت امن وامان، نظم ونسق اور مختلف بربر اقوام اور رومیوں کے درمیان آپسی مفاہمت کے لحاظ سے بہترین دور تھا۔ اس نے رومی شہنشاہوں کی طرح حکومت کی اور عظیم سلطنت روما کے قدیم طرزِ حکومت کو بنائے رکھا۔ گاتھ فاتحین اور رومی عوام کے درمیان رواداری قائم کی وہ خود عیسائی تھا۔ اس نے رومی کیتھولک کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ اس کی حکومت وسلطنت کو قانونی واخلاقی حیثیت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بازنطینی شہنشاہ جینو سے گفتگو کا آغاز کیا۔ 491ء میں جینو کی موت واقع ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد انیسٹو سیس نے تھیوڈورک کی سلطنت کو تسلیم کر لیا۔ اس سے اسے رومیوں کی معاونت ملنے میں آسانی ہو گئی۔

تھیوڈورک نے تقریباً 3 دہائیوں تک حکومت کی۔ اس کے دور میں زراعت اور صنعت وتجارت میں زبردست اضافہ ہوا۔ اٹلی کے اہم شہروں کی تزئین کاری کی گئی۔ شاہراہوں کی تعمیر ومرمت کے ذریعے سفر اور تجارت دونوں میں آسانی ہوئی۔ حقیقتاً تھیوڈورک کا عہد خوشحالی اور امن وامان کا دور تھا۔ اس کی بہترین انتظامی صلاحیتوں نے سلطنت کے ہر گوشہ کو فیضیاب کیا۔ وہ دارالسلطنت سے ہی دور دراز کے اعلیٰ افسران سے لے کر معمولی کارندوں تک پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس نے قدیم رومی قوانین کو از سر نو لاگو کیا۔ عوام کے دونوں طبقات آسٹرو گاتھ اور رومی اس سے خوش تھے۔ آسٹرو گاتھ کی اپنی عدالتیں تھیں جن میں اُن کے رسم ورواج کے مطابق فیصلے کیے جاتے۔ اگر فریق گاتھ اور رومی ہوتے تو گاتھ مصنفین رومی صلاح کاروں کی مدد سے فیصلے کرتے۔ گاتھ کو فوجی خدمات کے لیے مجبور کیا جاسکتا تھا جبکہ رومی اس معاملے میں آزاد تھے۔ دیوانی وفوجداری معاملات میں گاتھ بھی رومی قوانین کے ماتحت تھے۔ سلطنت کے بیشتر اعلیٰ عہدوں پر رومیوں کا ہی قبضہ رہا۔ رومی سینیٹ کے ساتھ تھیوڈورک کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ وہ مذہبی رواداری قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ یہودی بھی اس کی سلطنت میں محفوظ تھے۔ اُن پر ظلم کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتیں۔

سلطنت کے خارجی معاملات میں وہ جرمن ریاستوں کے مجموعی مفاد کو ترجیح دیتا۔ مستقبل میں کسی بھی رومی سلطنت کے قیام کو روکنے کے لیے اس نے جرمن ریاستوں میں آپسی میل جول میں اضافہ کی کوششیں کیں۔ ریاستوں کے مابین خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لیے اس نے ازدواجی رشتوں کا سلسلہ شروع کیا، جس کا فائدہ اسے یقیناً حاصل ہوا۔

حقیقتاً تھیوڈورک کا عہد عظیم رومی سلطنت کی ہی بازگشت محسوس ہوتا ہے، لیکن اس کے زوال کے عناصر بھی اسی کے دورِ حکومت میں پیدا ہو گئے۔ 518ء میں جسٹن مشرقی سلطنت کا حاکم بنا۔ ونڈال بلڈیری کھلے عام آسٹرو گاتھ کی مخالفت کرنے لگا۔ 523ء میں اس نے مشرقی حکمراں سے ساز باز کر لی۔ جسٹن نے اپنی ریاست میں ایرانیوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دی، جس میں رومی اسٹیٹ کے کچھ ارکان بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس سے پہلے کے تھیوڈورک ان کی بیخ کنی کرتا۔ 526ء میں اس کی موت واقع ہو گئی، جس کے بعد اس کے

نابالغ بیٹے الیستھیرک نے 8 سال تک حکومت کی۔ لیکن اب آسٹروگاتھ ریاست زوال پذیر ہو چکی تھی اور 556ء میں جسٹینین نے اٹلی پر قبضہ کر لیا۔

1.3.3 وسی گاتھ ریاست (418-711 A.D.)

وسی گاتھ بادشاہ یورک (466-484) کے زمانے میں جنوب مغربی فرانس و اسپین کے علاقے وسی گاتھ ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ شہنشاہ نیپوس نے 475ء میں ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے روم اور بحیرہ روم کے علاقوں کو ریاست کی سرحدوں کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ بعد میں ایک دیگر معاہدہ کے ذریعے اس کے علاقے میں توسیع ہو گئی۔ معاہدوں کے علاوہ یورک نے طاقت کے ذریعے بھی اپنی ریاست میں اضافہ کیا۔ 484ء میں اس کی موت تک پیرینیز سلسلہ کوہ سے جبرالٹر کی خلیج تک کا ایک وسیع علاقہ اس مملکت کا حصہ بن چکے تھے۔ گاتھ ریاست کو مضبوطی سے قائم رکھنے کے لیے اس نے سلطنت روم اور کیتھولک فرقہ دونوں کی مخالفت کی پالیسی پر عمل کیا۔ حالانکہ اس سے خود اس کی ریاستی تنظیم کو نقصان پہنچا۔ وہ پہلا حکمراں تھا جس نے رومی روایات اور وسی گاتھ رواجوں پر مشتمل ایک سول کوڈ نافذ کیا۔ رومیوں اور گاتھوں دونوں پر ان کے علیحدہ روایات کی بنیاد پر انتظامیہ قائم کی۔ دونوں کو کسی طرح کی بھی آمیزش سے پاک رکھنے کے لیے ازدواجی رشتوں کے قیام پر پابندی لگائی۔ رومیوں پر ٹیکسوں کا بوجھ زیادہ تھا، جس نے اُن کی خوشحالی کو متاثر کیا اور ریاست کو بھی کمزور کیا۔ 484ء میں یورک کی موت کے بعد اس کا جانشین ایلبرک دوم (485-507) کمزور ثابت ہوا اور فرینک فاتح کلوونس کے ہاتھوں مارا گیا، جس کے بعد صرف اسپین گاتھوں کے قبضے میں رہ گیا۔ 531ء میں اس خاندان کا آخری حکمراں املرنک کے مارے جانے کے بعد تھیوڈوسیس نے حالات کو سنبھال لیا۔ وہ تھیوڈورک کا ایک سابق سیاسی نمائندہ تھا۔ آئندہ 17 سال تک اس نے فرینک حملہ آوروں کا بخوبی سامنا کیا۔ اس کی موت کے بعد اسپینی جاگیرداروں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ ان حالات کا فائدہ اُٹھا کر ایک دوسرے وسی گاتھ سردار اتھناگل نے مشرقی رومی شہنشاہ جسٹینین کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور ٹولیڈو کو اپنا دارالسلطنت بنا کر حکومت شروع کر دی۔ اس نے 554ء سے 567ء تک حکومت کی۔ اس کا جانشین لیومینیگل اس خاندان کا سب سے عظیم حکمراں تھا۔ اس نے 567ء سے 586ء تک بڑے کروفر کے ساتھ اقتدار سنبھالا۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے مشرقی رومی شہنشاہ سے کارڈرا (قرطبہ) چھین لیا۔ اس کے جانشین رکارڈ اول نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں یہودیوں پر زبردست ظلم و ستم ہوئے، جس کے نتیجے میں ہزاروں یہودیوں نے جلاوطنی اختیار کی۔ دھیرے دھیرے ریاست کے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں کمزوری آنے لگی۔ بادشاہ ایگسکا (686-701) کے دور میں بڑے پیمانے پر بغاوتوں کا آغاز ہو گیا۔ ایگسکا کے پوتے ایجلا کو ڈیوک راڈرک نے 710ء میں تخت سے اتار دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ایجلا اور اس کے ہم نوازوں نے مسلمانوں سے مدد مانگی، جو اس وقت مغربی ایشیاء و آفریقہ میں اپنے اقتدار کو وسیع کر رہے تھے۔ نتیجتاً شمالی آفریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کے حکم پر اس کے غلام طارق بن زیاد نے ایک چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ 711ء میں اسپین پر حملہ کر دیا۔ راڈرک نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ کچھ سال میں ہی اسپین کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔

1.3.4 ریاست برگنڈی

برگنڈین، گاتھ (جرمن) نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچویں صدی کے وسط میں انہوں نے رومیوں کی اجازت سے وائے کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ بعد میں ڈپلومیسی اور فتوحات کے ذریعے انہوں نے اپنی پوزیشن مضبوط کرلی۔ موجودہ سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے ایک بڑے حصے پر ان کا اقتدار قائم ہوگیا۔ آج بھی ایک علاقہ فرانس میں بگنڈی کے نام سے جانا جاتا ہے، جو اس قبیلے کے شاندار ماضی کو یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فرینک متواتر حملے کررہا تھا۔ ان کے منظم حملوں کا سامنا کرنا ان کے لیے مشکل ہوگیا۔ ان کا آخری حکمراں کنڈمار تھا جو فرینک حملہ آور کلونس کے ہاتھوں مارا گیا، جس کے بعد یہ ریاست ختم ہوگئی۔

1.3.5 ونڈال ریاست

ونڈال قوم کے افراد چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر میں پینونیا سے نکل کر گال (فرانس)، اسپین اور شمالی آفریقہ کے علاقوں میں بس گئے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ جرمن اقوام میں ونڈال سب سے زیادہ متشدد، جابر اور ظالم تھے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ انہوں نے اپنے زیر نگیں علاقوں میں زبردست دہشت پھیلا رکھی تھی۔ خصوصاً بحیرہ روم کا ساحلی حصہ تو ان کے ظلم و جبر کا زبردست گواہ تھا۔ ان کی طاقت و دہشت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فصیل بند قلعے بھی ان کا نشانہ بننے سے محفوظ نہیں تھے۔ آفریقی علاقوں میں کارتھیج ان کا دارالسلطنت تھا۔ علاوہ ازیں سارڈینیا و کارسیکا کے علاقے بھی ان کے زیر اقتدار تھے۔ کیتھولک ان کی بربریت کا خاص شکار تھے۔ اس بہیمیت کو دیکھتے وہئے اور کیتھولک پیروکاروں کو ان کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے مشرقی رومی سلطنت کے شہنشاہ جسٹینین نے ایک بڑا لشکر بھیج کر ان کو نہ صرف شکست فاش دی بلکہ ان کی طاقت کا شیرازہ بھی منتشر کردیا۔ اُنہیں شمالی آفریقہ سے مار بھگایا گیا، جس کے بعد ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ ان کی ایک بڑی تعداد مشرقی رومی سلطنت کی فوج میں شامل ہوگئی اور کچھ نسلوں بعد ان کا علیحدہ وجود اور طاقت بالکل ہی ختم ہوگیا۔

1.3.6 ریاست لومبارڈ

چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں لومبارڈ نے جن کا تعلق بربر اقوام میں سے تھا۔ ڈینیوب کے علاقے سے ہجرت کرنا شروع کی اور اٹلی میں داخل ہوئے۔ یہاں میدان اُن کے لیے خالی تھا کیونکہ شہنشاہ جسٹن دوم نے اپنی افواج کو اٹلی سے واپس بلالیا تھا۔ سویڈیلا، ورونا، ملان، پیوپا یہاں تک کہ مغربی آلپس تک کے علاقے ان کے قبضے میں آگئے۔ لومبارڈ سردار الیوٹن نے اپنی قوم کو زبردست قوم کا حامل بنادیا، لیکن 572ء میں ایک ایسی سازش کے تحت اسے قتل کردیا گیا، جس میں اس کی بیوی بھی شامل تھی۔ آئندہ 35 سال تک لومبارڈ ڈیوکوں کا ایک گروپ اٹلی کے مختلف علاقوں پر فتح حاصل کرلی۔ 584ء میں انہوں نے اوتھاری کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اس کے جانشین ایزیلف کے دور میں 605ء میں لومبارڈ ریاست نے باقاعدگی حاصل کی۔ اس نے مخالف ڈیوکوں کے خلاف کارروائیاں کیں۔ مختلف طاقتور سرداروں سے مفاہمت کی اور اپنی ریاست میں توسیع کی۔

لومبارڈ بھی ظلم و ستم میں کچھ کم نہ تھے۔ حقیقتاً ونڈال کے بعد بہیمانہ کارروائیوں میں ان کا درجہ ہے۔ ایک بڑی تعداد میں رومی

کسانوں کو غلام بنایا گیا، قتل کیا گیا اور اُن کے علاقوں سے بے دخل کیا گیا۔ انہوں نے بہترین اراضی اپنے قبضے میں رکھی اور اپنی بالادستی کو قائم رکھا۔ لیکن قدرت کا اصول ہے کہ جب دو تہذیبوں کا اختلاط ہوتا ہے تو لین دین کا عمل انجام پاتا ہے۔ یہی رومیوں اور لومبارڈوں کے درمیان ہو۔ فاتحین نے رومی زبان اور تہذیب کو اپنانا شروع کر دیا۔ عیسائیت نے بھی لومبارڈی تمدن پر اپنا اثر ڈالا۔ اس اختلاط کے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے، جنہوں نے لومبارڈ ریاست کو کمزور کرنے کا کام کیا۔ مثلاً مختلف پوپوں کی مخالفت کے باعث ریاست کو اخلاقی شناخت نہیں مل پائی۔ اس کے علاوہ چرچ کو زمین دینے کی وجہ سے ریاست کی آمدنی پر بھی اثر پڑا، جس نے بتدریج سیاسی طاقت کو بھی کم کیا۔ آخر کار 774ء میں شارلین نے اسے ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

1.3.7 انگلینڈ کی اینگلو سیکسن ریاستیں

پانچویں صدی کے آغاز میں ایک رومی فوج انگلینڈ میں موجود تھی، جو ان کی طاقت و اقتدار کی ضامن تھی۔ لیکن جب اٹلی پر بربر اقوام کے حملے شروع ہوئے تو شہنشاہ ہونوریس نے ان سے نمٹنے کے لیے 410ء میں مذکورہ فوج کو انگلینڈ سے واپس بلا لیا۔ اس کا فائدہ اُٹھا کر شمال سے پکٹ اور اسکاٹ نے حملہ کر دیا۔ ٹھیک اُسی وقت سمندر کی طرف سے جرمن قوم 'اینگلو سیکسن' بھی حملہ آور ہو گئی۔ برطانوی باشندوں نے روم سے مدد مانگی، لیکن اس وقت رومی سلطنت خود اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ برطانیہ کی مدد کر سکے۔ چنانچہ جوٹ 'اینگل اور سیکسن بہ آسانی برطانیہ میں داخل ہو گئے اور مختلف علاقوں میں اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے آخر تک آٹھ علیحدہ آزاد ریاستوں کا قیام عمل میں آ گیا۔ ان میں مارسیا' نارد مبریا' نیسیکس اور ایسکس اہم تھے۔ یہ سبھی ریاستیں آپس میں جنگ و جدال میں مصروف تھیں۔ ان کی اس کشمکش کا خاتمہ ایسیکس کے حکمراں ایگبرٹ (802-839) نے کر دیا۔ اس نے سبھی پر فتح حاصل کر لی اور متحدہ ریاست یعنی انگلینڈ کا پہلا بادشاہ بن گیا۔ اس طرح عظیم رومی سلطنت وسعت و طاقت کے مختلف مرحلوں سے گذر کر روبہ زوال ہو گئی۔

1.4 عہدِ وسطیٰ کا آغاز اور عیسائی مذہب

تیسری صدی عیسوی نے چھٹی صدی عیسوی کے درمیان عیسائیت میں ایک ایسی روایت نے جنم لیا، جس کے تحت ایک نیا نظام وجود میں آیا۔ ایسا نظام جس نے سماج پر بحیثیت مجموعی گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ رہبانیت پر مبنی مانیسٹیریز (Monesteries) یعنی خانقاہی نظام تھا، جو لگ بھگ ایک ہزار سال تک یوروپ میں مخصوص اہمیت کا حامل رہا۔ یونانی زبان میں Monacus تیار رہنے والے فرد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں اس لفظ کا اطلاق خانقاہی زندگی گذارنے والے راہبوں کے گروپ کے لیے ہونے لگا۔ یہ راہب دنیوی زندگی تج کر کے' ہر طرح کی آسائش سے کنارہ کر کے مشقت بھرے ایام گذارنا ہی معراج سمجھتے تھے۔ ان راہبوں کی دو اقسام تھیں۔ ایک انفرادی۔ یہ کسی جنگل بیابان میں تنہا رہتے تھے اور تکلیفیں برداشت کرتے۔ دوسرے جو گروہ بنا کر کسی ایک مقام پر رہتے۔ یہودیوں' ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروکاروں میں رہبانیت کے عناصر پہلے سے ہی موجود تھے۔ لیکن عیسائیوں میں جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے، تیسری صدی عیسوی میں اس کے آثار پیدا ہونا شروع ہوئے اور چھٹی صدی آتے آتے اس نے بالکل واضح اور منظم و منضبط شکل اختیار کر لی۔ اس مذہبی تبدیلی

میں اس وقت کے سماجی حالات کا اہم کردار رہا ہے۔ کلیسا سے وابستہ افراد کی دنیوی لذتوں اور عیش وآرام کی طرف حد سے بڑھی ہوئی رغبت نے روحانیت میں دلچسپی رکھنے والے اور نفس کو قابو میں رکھنے کی خواہش رکھنے والے افراد میں بے زاری کا احساس پیدا کیا۔ دنیا کے تباگ اور آخرت کے حصول کے لیے انہوں نے رہبانیت کا راستہ اختیار کیا، جس کے نتیجے میں پورا ایک خانقاہی نظم وجود میں آیا، جس میں ظاہر کے مقابلے میں باطن کو اہمیت حاصل تھی۔ جسمانی حسن کی جگہ دل کی خوبصورتی کو ترجیح دی گئی۔ رہبانیت کے جواز کے لیے بائبل سے حوالے تلاش کیے گئے۔ عیسیٰ مسیح اور سینٹ پال کے اقوال سے یہ ثابت کیا گیا کہ نجات کا راستہ دنیا کے حصول میں نہیں بلکہ ہر طرح کی آسائش سے کنارہ اور نفس کی مشقت میں ہے۔

تیسری صدی سے مشرق کے عیسائی رہبانیت کی طرف مائل ہونا شروع ہوئے۔ مصری باشندہ سینٹ اینٹونی کو ''بابائے رہبانیت'' کہا جاتا ہے۔ ہزاروں افراد اس کی پیروی میں خانگی زندگی چھوڑ کر سنیاسی بن گئے۔ مشرقی راہبوں میں سب سے مشہور سینٹ سیمبل اسٹائیلائیٹس تھا۔ اسے ''ستون کا سینٹ'' کہا جاتا ہے، کیونکہ اس نے 36 سال صرف 3 فٹ قطر والے ستون پر بیٹھ کر گذار دیئے۔ چوتھی صدی تک رہبانیت یوروپ میں داخل ہوگئی۔ مختلف راہبوں کی شہرت سے متاثر ہو کر ان کے گرد شاگردوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ ویرانوں میں جھونپڑیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور مختلف صوفیوں (سینٹ) کی خانقاہیں وجود میں آگئیں۔ خانقاہوں اور راہبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سبب یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے آپسی معاملات اور اجتماعی سرگرمیوں کے لیے کچھ اصول وضوابط متعین ہونے چاہیے۔ چنانچہ سب سے پہلے مصری راہب پیکومیسیس نے چوتھی صدی عیسوی میں اپنے پیروکاروں کی رہنمائی کے لی قوانین منضبط کیے۔ اس میدان میں سب سے زیادہ شہرت سینٹ بنیڈکٹ (480-543) کے تیار کردہ کوڈ نے لی۔ اس نے روم اور نیپلس کے 'بیچ مونٹ کوسینو' کی مشہور خانقاہ قائم کی۔ اس کے پیروکار بینیڈکٹائن کہلائے۔ یوروپ میں رہبانیت کا بول بالا تو ہوتا رہا، لیکن وقت کے ساتھ اس میں وہ بہت ساری خامیاں اور اخلاقی خرابیاں در آئیں جن کے رد عمل میں یہ نظام وجود میں آیا تھا۔ خانقاہوں کو نذرانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی نے خوشحالی تو بخشی لیکن اخلاقی حیثیت سے وہ زوال کا شکار ہو گئیں۔ بدکرداری اور مختلف جرائم میں خانقاہوں اور راہبوں کا دامن بھی ملوث ہونے لگا۔

دسویں صدی عیسوی میں بیشتر خانقاہوں کی یہی صورتحال تھی۔ پُرسکون، سادہ اور پاکیزہ طرزِ حیات کے لیے بینیڈکٹ کے قوانین بے اثر ہونے لگے تھے۔ خوش قسمتی سے ایسے دور میں بھی بہت سے لوگ دکھائی دیتے تھے جن کے دل میں مذہب کے لیے مسیحی عقیدت اور پاکیزگی کا احساس باقی تھا۔ چنانچہ یوروپ کے مختلف حصوں میں اصلاح کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اٹلی میں نِلس اور رومالڈ، لورین میں رچرڈ اور فلینڈرس میں پیو جیسے راہبوں نے خانقاہوں کی اس حالتِ زار پر سخت تنقید کی۔ آغاز میں اصلاحات کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ ان اصلاحی تحریکوں میں سب سے اہم برگنڈی میں واقع کلونی کی تحریک تھی۔ کلونی کی خانقاہ کا قیام 910ء میں عمل میں آیا تھا۔ آغاز سے اس کو جاگیرداروں کی مداخلت سے آزاد رکھا گیا تھا۔ یہ براہ راست پوپ کے ماتحت رکھی گئی۔ اس میں بینیڈکٹ قوانین نافذ کیے گئے۔ دسویں صدی کے وسط سے بارہویں صدی کے وسط تک کلونی کو مغربی یوروپ میں سب سے اہم مذہبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

1.4.1 نئے دور کے آغاز میں یوروپی سماج

خانقاہوں کی اصلاح کے لیے چلنے والی تحریکوں نے یوروپ کے تمدن و معاشرت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ مذہبی اداروں کی ظلم و ستم کے خلاف اُٹھنے والی آوازوں نے جابر نائیٹوں کو بھی بتدریج مہذب بنادیا۔ راہبوں کی سادہ و پُر مشقت زندگی جس میں ہر طرف سے دنیا سے بے رغبتی جھلکتی تھی، عوام و خواص دونوں کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ جاگیر دار عوام سے حاصل ہونے والی دولت فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کرنے لگے۔ کلونی سے وابستہ خانقاہیں تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گئیں۔ مذہبی علوم کے ساتھ تاریخ اور لاطینی ادب کے مطالعہ کے لیے انہوں نے شہرت حاصل کی۔ رومی قوانین اور فن تعمیر کو جلا بخشی۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ خانقاہی نظام نے یوروپ پر اپنے مثبت اثرات مرتب کیے۔ گو منفی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن زندگی کے بہت سے پہلو فیض یاب ہوئے۔

یوروپ میں قدیم عہد کے اختتام اور عہدِ وسطیٰ کے آغاز کے عبوری دور کا جائزہ لینے سے یہ بات بہ آسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور مذہبی شعبوں میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔ سیاسی اسٹیج پر عظیم مغربی رومی سلطنت ماضی کا حصہ بن گئی جبکہ اس کا مشرقی حصہ اگلے ایک ہزار سال تک اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتا رہا۔ مغربی سلطنت کے کھنڈرات پر نئی ریاستیں وجود میں آئیں اور اُن کو بھی مختلف مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ مذہبی میدان میں ایک طرف تو لگ بھگ پورا یوروپ عیسائیت کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ دوسری طرف خود عیسائی مذہب میں کچھ نئے عناصر پیدا ہوئے، جس میں رہبانی فکر بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں خانقاہیت کا وہ نظام وجود میں آیا جس نے طرزِ حیات کے بیشتر پہلوؤں کو متاثر کیا۔

سماجی و معاشی تبدیلیاں

اس عبوری دور میں روم کے شہر زوال کا شکار ہوئے۔ اب نہ انہیں پہلے کی سی معاشی مرکزیت حاصل رہی اور نہ ہی انتظامی نقطہ نظر سے اہم رہے۔ شہروں کی آبادی میں کمی واقع ہوئی، جس کا ایک بڑا سبب مستقل ہونے والی جنگیں تھیں۔ اس کے علاوہ وبائی بیماریاں خصوصاً طاعون اور معاشی بدحالی نے بھی شہروں پر منفی اثر ڈال۔ انتظامیہ کے نقطہ نظر سے یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ کلیسا مذہبی اعتبار سے ہی نہیں سماجی سطح پر بھی بہت مضبوط اکائی بن کر ابھری۔ یہی نہیں بلکہ زوال پذیر رومی سلطنت کے نظم و نسق میں بھی اہم کردار ادا کرنے لگے۔ اس دور میں یوروپ کی سماجی ساخت میں بھی بڑی تبدیلی آئی۔ مختلف بربر اقوام مثلاً وسی گوتھ، آسٹر گوتھ، ونڈال اور فرینگ وغیرہ رومی سلطنت میں داخل ہوئیں اور اپنی اپنی ریاستیں بھی قائم کیں۔ مقامی آبادی کے ساتھ ان کے اختلاط نے تہذیب و ثقافت کو نئی جہتیں عطا کیں۔ رسم و رواج اور روایات کے لین دین سے نئے تمدن و معاشرت کی بنیاد پڑی۔

عہدِ وسطی کی ایک بڑی خصوصیت جاگیرداری نظام نے بھی اسی دور میں اپنے پیر پسارے۔ مرکزی اقتدار کے کمزور ہونے سے مقامی سرداروں اور اثر دار ذی حیثیت افراد نے عوام کو تحفظ فراہم کیا۔ یہی اعلیٰ طبقہ بعد میں بڑے بڑے جاگیرداروں کی شکل میں قوت و اقتدار کا مالک بن گیا۔ شہری صنعت و تجارت کی کمی آئی۔ اس کی جگہ مقامی و دیہی زرعی معیشت نے لے لی۔ جاگیرداروں کی گڑھیاں اور میز معیشت

کے مرکز بن گئے۔ راستوں کے محفوظ نہ ہونے کے سبب بیرونی خاص طور سے طویل مسافت پر منحصر تجارت کم ہو گئی۔ اس کی جگہ مقامی و خود مکتفی تجارت اہم ہو گئی۔ رومی سکوں کا سرکولیشن کم ہو گیا اور ان کی قیمت گر گئی، بلکہ بارٹر سسٹم کا رواج زیادہ ہو گیا۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں یوروپی سماج، معیشت، مذہب اور تہذیب و ثقافت میں تبدیلیاں آئیں۔ جنہوں نے آگے چل کر عہدِ وسطیٰ کے یوروپ کو واضح شکل دی۔ عیسائیت کی اشاعت اور پھر رومیوں اور بربر اقوام کے ساتھ اُن کے اختلاط کے نتیجے میں جو تہذیب و ثقافت وجود میں آئی۔ وہ یوروپ کے وسطی دور کی شناخت بنی۔

1.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی میں مغربی رومی سلطنت کے زوال (476ء) کے ساتھ یوروپ میں عہدِ وسطیٰ کا آغاز ہوا۔ حالانکہ مشرقی رومی سلطنت جسے بازنطینی سلطنت بھی کہا جاتا ہے، آئندہ ایک ہزار سال تک اپنی اہمیت قائم رکھنے میں کامیابی رہی۔ وہ عبوری دور جس میں قدیم یوروپ، عہدِ وسطیٰ میں داخل ہوا، اسے Late Antiquity کہا جاتا ہے۔ دانشوروں کے اندازے کے مطابق یہ تیسری صدی عیسوی سے نویں صدی کے درمیانی عرصے پر محیط ہے۔ اس مدت میں عظیم مغربی رومی سلطنت کا بتدریج زوال اور ابتدائی وسطی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔

313ء میں شہنشاہ کانسٹنٹائن نے ''میلان ایڈکٹ'' کے ذریعے عیسائیت کو قانونی شکل دی، جس کے بعد عیسائی مذہب کی ترویج و اشاعت اور اثرات میں اضافہ ہوا۔ اسی بادشاہ نے کانسٹینوپل (Constantinople) آج کا استنبول بسایا۔ تھیوڈوسیس اول (-379 393) آخری حکمراں تھا، جس نے متحدہ (مشرقی و مغربی) رومی سلطنت پر حکمرانی کی۔ اس کے کمزور و نااہل جانشینوں کے دور میں مغربی سلطنت کے زوال کا عمل تیز ہو گیا۔ اور 476ء میں رومولس آگسٹولس کی معزولی کے ساتھ اس عظیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے زوال کے اسباب میں اس کی غیر معمولی وسعت، فوجی تنظیم میں کمزوری، معاشی بدحالی اور بربر اقوام کے مسلسل حملے اہمیت رکھتے ہیں۔ آخر الذکر سبب سب سے اہم ہے۔ ان بربر اقوام میں ہن، گاتھ، ونڈال اور فرینک پہلے سے ہی سلطنت میں رہائش اختیار کر چکے تھے اور نظم و نسق میں شامل تھے۔ بلکہ بہت سے فوج میں بھی عہدے حاصل کر چکے تھے۔ اہلِ رثوم سے ان کے ازدواجی رشتے قائم تھے۔

نااہل رومی حکمران گات، ونڈال اور ہن کے پے در پے حملوں کا سامنا بہت دنوں تک نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ اوڈواسیر نے 476ء میں آخری شہنشاہ رومولس آگسٹس کو معزول کر کے اقتدار پر قضبہ کر لیا، جس کے بعد یہ پورا علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا، جن پر بربر اقوام کے مختلف سرداروں نے اپنی حکومتیں قائم کیں، جو اس طرح سے تھیں:

- آسٹروگاتھ (اٹلی): اوڈواسیر نے 493ء تک حکومت کی۔ اس پر آسٹروگاتھ نے حملہ کر دیا۔ اسے شکست ہوئی۔ قتل کر دیا گیا، جس کے بعد تھیوڈرک اعظم (526-493) نے اقتدار سنبھالا۔ اس کا دورِ حکومت نظم و نسق، امن و امان اور معاشی اعتبار سے بہترین دور تھا، جسے عظیم رومی سلطنت کی بازگشت بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد ریاست کمزور ہو گئی اور 556ء میں

جسٹینین نے اٹلی پر قبضہ کر لیا۔

- وسی گاتھ (جنوب مغربی گال اور اسپین): یورک (484-466) اس کا بانی تھا۔ اس کی موت کے بعد نااہل حکمراں اور آپسی کشمکش نے اسے کمزور کر دیا اور بالآخر 711ء میں امویوں کے دور میں طارق بن زیاد نے اسے فتح کر لیا اور اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آگیا۔
- ونڈال: شمالی آفریقہ: یہ ظالم اور متشدد تھے۔ ان کا دورِ حکومت دہشت و جبر سے بھرا تھا۔ جسے بالآخر مشرقی رومی شہنشاہ جسٹینین نے ایک بڑا لشکر بھیج کر شکست دی اور ان کی قوت کو بالکل ختم کر دیا۔
- لومبارڈ: چھٹی صدی عیسوی میں لومبارڈ نے اٹلی کے ایک حصہ پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اسے 774ء میں شارلیمن نے ختم کر دیا۔
- انگلینڈ کی اینگلو سیکسن ریاست: پانچویں صدی کے آغاز میں جرمن قوم اینگلو سیکسن انگلینڈ پر حملہ آور ہوئی، جس کے نتیجے میں آٹھ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ لیکن جلد ہی ایلیکس کے حکمراں ایگبرٹ نے سب کو شکست دے کر ایک متحدہ حکومت قائم کر لی۔

اس طرح عظیم رومی سلطنت کے بعد اس کے کھنڈرات پر مختلف ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ اسی عبوری دور میں عیسائی مذہب میں بھی کچھ نئے عناصر داخل ہوئے، جن میں رہبانیت سب سے زیادہ اہم تھی۔ راہبوں دنیوی زندگی سے کنارہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں میں مشقت بھری زندگی گذارنا شروع کی۔ انہوں نے خانقاہیں قائم کیں۔ اس خانقاہی نظام نے اہل یوروپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا۔ بعد میں ان خانقاہوں میں پیدا ہونے والی بہت برائیوں کو دور کرنے کے لیے اصلاحی تحریکیں چلائی گئیں۔

اس دور میں صرف سیاسی سطح پر ہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں بلکہ سماجی و معاشی میدانوں میں بہت سے نئے عناصر نے جنم لیا۔ مختلف اقوام کے میل جول اور اختلاط نے ایک ایسے تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی جو عہدِ وسطیٰ کے یوروپ کی شناخت بنے۔ مغربی رومی سلطنت کے زوال اور سیاسی انتشار نے معیشت پر منفی اثرات چھوڑے، صنعت و تجارت متاثر ہوئے، خصوصاً بیرونی اور دور دراز کے علاقوں سے ہونے والی تجارت تو ختم ہی ہو گئے، جس کی وجہ سے بڑے شہروں کو زوال آیا۔ معیشت کی دیہی ساخت میں جاگیرداروں کی گڑھیوں (Manor) نے اہمیت حاصل کر لی۔

1.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

بازنطینی سلطنت	:	مشرقی سلطنت روما، جس کا دار السلطنت قسطنطنیہ تھا۔
بربر اقوام	:	نیم مہذب قومیں انارکی
گال	:	فرانس
ہسپانیہ	:	اسپین

کیتھولک : عیسائیوں کا ایک فرقہ

اینگلو سیکسن : جرمن قوم، جس نے انگلینڈ میں اپنا اقتدار قائم کیا۔

راہب : دنیا سے کنارہ کشی کر کے جنگل بیابان میں مشقت بھری زندگی گذارنے والے فرد

خانقاہ(Monestry): راہبوں کے گروہ کی قیامگاہ یا مرکز

بارٹر سسٹم : اشیاء کے بدلے اشیاء کی خریداری

1.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رومی سلطنت کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا عمل کس شہنشاہ کے دور میں شروع ہوا؟

(الف)نیرو (ب)ڈائیوکلیٹین (ج)کانسٹنٹائن اعظم (د)مارکس اوریلیس

2. مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ کس سال ہوا؟

(الف)395ء (ب)410ء (ج)330ء (د)476ء

3. متحدہ رومی سلطنت کا آخری عظیم حکمراں کون تھا؟

(الف)رومولس آگسٹولس (ب)کانسٹنٹائن اعظم (ج)تھیوڈوسیس اول (د)جسٹینین

4. مغربی رومی سلطنت کے زوال کا سب سے اہم سبب کیا تھا؟

(الف)زرعی بحران (ب)قحط سالی (ج)بربر اقوام کے مسلسل حملے (د)سمندری تجارت کا خاتمہ

5. مغربی رومی سلطنت کا آخری شہنشاہ کون تھا؟

(الف)اوڈواسیر (ب)تھیوڈوسیس اول (ج)کانسٹنٹائن اعظم (د) رومولس آگسٹولس

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ابتدائی رومی شہنشاہنوں پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. سلطنت روما پر حملہ آور ہونے والی بربر اقوام کون کون سی تھیں؟
3. سلطنت روما کے زوال کے بعد نمودار ہونے والی ریاستوں کے نام بتایئے۔
4. تھیوڈرک اعظم کے دورِ حکومت پر روشنی ڈالیے۔
5. رہبانیت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. رومی سلطنت کے زوال میں بربر اقوام کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. خانقاہی نظام پر مفصل مضمون لکھیے۔
3. وسی گاتھ اور ونڈال ریاستوں کے ادوار کا تجزیہ کیجیے۔

جوابات:1۔(ج)کانسٹنٹائن اعظم 2۔(د)476ء 3۔(ج)تھیوڈوسیس اول 4۔(ج) بربر اقوام کے مسلسل حملے
5۔(د) رومولس آگسٹولس

اکائی 2۔ مغربی یورپ میں جاگیر دارانہ نظام

(Feudalism in Western Europe)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 رومی سلطنت کا زوال اور جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا

2.3 جاگیر دارانہ نظام کا مفہوم و مطلب

2.4 جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اور ارتقا

2.5 جاگیر دارانہ نظام کی بنیادی ساخت

2.6 جاگیر دارانہ نظام کا معاشی پہلو

2.7 جاگیر دارانہ نظام کی سماجی ساخت

2.8 فوجی نظم و نسق کا ایک طاقتور نظام

2.9 جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا سے متعلق تفصیلی بحث

2.10 جاگیر دارانہ نظام کی ساخت اور مختلف پہلوؤں سے متعلق مورخین کے خیالات

2.11 جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے وجوہات

2.12 اکتسابی نتائج

2.13 کلیدی الفاظ

2.14 نمونہ امتحانی سوالات

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

2.0 تمہید (Introduction)

گیارہویں صدی میں ابھرنے والا جاگیر دارانہ نظام(Feudalism)عہد وسطیٰ کے یورپی سماج کی ایک نمایاں خصوصیت تھااور رفتہ رفتہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ یورپ کے تمام ممالک میں رائج ہو گیا۔ بارہویں صدی میں یہ نظام اپنے عروج کو پہنچااور بالآخر پندرہویں صدی میں زوال پذیر ہونے لگا۔فیوڈل(Feudal)لفظ،فیوڈ(Feud)یعنی جاگیر سے مشتق ہے جس کے معنی مشروط خدمت کے بدلے اراضی کے کسی حصّہ پر ملکیت کا اختیار حاصل ہونا تھا۔ یہ نظام جس کے تحت بادشاہ،زمینداروں اور ان کے ماتحت کسانوں کو فوجی خدمات کے بدلے زمین تفویض کرتا تھا،فیوڈالزم(Feudalism)یعنی جاگیر دارانہ نظام کہلایا۔اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تحت سیاسی، سماجی اور معاشی ادارے زمین کی ملکیت کے توسط سے ایک دوسرے سے باہمی رشتے میں جڑے ہوئے تھے۔ یہ نظام رفتہ رفتہ خود بخود وجود میں آیا۔ کسی بادشاہ یا پھر اس کے اعلانیہ سے وجود میں نہیں آیا۔ سلطنت روم کے زوال کے بعد دشوار کن حالات اور غیر یقینی صورت حال نے یورپ کو مسلسل جنگی حالات میں لا کھڑا کر دیا تھا۔جنگ کی وجہ سے تباہی و بربادی نے اس نظام کو وجود میں لانے کے لئے راستہ ہموار کیا تھااور پھر یورپ میں یہ نظام پھیل گیا۔ مختلف ممالک میں اس میں نمایاں فرق دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اس کی بنیادی ساخت اور اہم خصوصیات،یورپ کے دیگر ملکوں میں بھی تقریباً یکساں ہی رہیں۔اس نظام کی بنیاد زمین کی ملکیت پر مبنی تھی۔رومی سلطنت میں امراء کے پاس بہت زیادہ زمین ہوتی تھی جسے لیٹیفنڈیا(Latifundia)یعنی زرعی املاک کہا جاتا تھا۔وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ امرا کے قبضے میں مزید اور زمینیں آگئیں اور وسیع جاگیروں کا نظم بہت مشکل ہو گیا۔لہٰذا امرا طبقہ نے دوسرے لوگوں کو ان کی فوجی خدمات کی بنیاد پر اپنی اراضی کے کچھ حصّے تفویض کر دیئے۔اس نظم وضبط کو بینیفزم(Beneficium)یعنی مفاد کہا جاتا تھا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ نظم موروثی بن گیااور اس کو فیف(Fief)یعنی جاگیر کے نام سے جانا جانے لگا۔ جاگیر دارانہ نظام مخروطی طرز کا تھا۔ جس میں بادشاہ سب سے اوپر اور زرعی غلام(Serf)سب سے نیچے ہوتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے یورپی سماج کی معاشی ساخت مینوریل سسٹم(Manorial System)یعنی گڑھی کے نظام پر قائم تھی۔ سلطنت روم کے زوال کے بعد یورپ میں سماجی اور سیاسی انتشار اور بدامنی پھیل گئی۔اس وقت جاگیر دارانہ نظام نے وہاں حکومت قائم کر کے بہتر نظم ونسق کے ذریعہ امن بحال کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ جاگیر دارانہ نظام کی بہت بڑی حصولیابی تھی۔اس نظام نے تہذیبی ورثہ کو بھی بچانے میں اہم کردار ادا کیا لیکن اس کی کچھ خامیاں بھی منظر عام پر نمایاں ہوئیں، مثلاً طبقاتی ساخت نے استحصال کو جنم دیا، جس سے نچلے طبقے بالخصوص کسانوں کا بڑے پیمانے پر استحصال بڑھ گیااور جس کی بدولت زرعی نظام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جاگیر دارانہ نظام کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گیارہویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک یورپ میں جاری رہا لیکن پندرہویں صدی میں یہ نظام مکمل طور پر زوال کا شکار ہو گیا جس کے باعث ایک سیاسی اور سماجی خلا پیدا ہو گیا اس خلا کو سرمایہ داری نظام نے پر کیا۔

جاگیر داری نظام یورپ کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔اس نظام کے قیام اور اس کی مختلف خصوصیات کے مطالعہ سے قبل سلطنت روم اور اس کی تہذیب کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس تہذیب کے زوال کے بعد ہی جاگیر داری نظام کا قیام بطور سیاسی نظام

کے عمل میں آیا۔ سلطنت روم کا مرکز اٹلی تھا۔ ایک ہزار سال قبل مسیح، دریائے ٹائبر کے جنوبی ساحل کی پہاڑی پر روم کا شہر آباد ہوا۔ اسی نسبت سے اسے رومی سلطنت کہا جاتا تھا۔ یہ سلطنت اپنی ترقی یافتہ تہذیب کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہوئی۔ رقبہ کے لحاظ سے یہ بہت ہی وسیع وعریض علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یونانی تہذیب کے زوال کے بعد رومی تہذیب کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا۔ مختلف سیاسی مراحل سے گذرتے ہوئے 27 قبل مسیح میں بطور سلطنت، روم کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلطنت کے قیام کا سہرا شہنشاہ اگسٹس اول کے سر جاتا ہے۔ سلطنت روم کی تاریخ دو صدیوں پر محیط ہے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- جاگیر دارانہ نظام کے معنیٰ و مطلب اور اس کی ابتدا اور ارتقا کے عوامل سے واقف ہو سکیں گے۔
- یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اور اس کی خصوصیات سے متعلق مورخین کے مابین مباحث سے روشناس ہو سکیں گے۔
- جاگیر دارانہ نظام کی بنیادی ساخت اور اس کے مختلف سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں سے واقف ہو سکیں گے۔
- جاگیر دارانہ نظام کے مختلف نظریات اور یورپ کے مختلف ممالک میں مختلف ادوار میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ ہو سکیں گے۔
- جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے باعث عوامل کا تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ کر سکیں گے۔

2.2 رومی سلطنت کا زوال اور جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا

روم کا سماج دو طبقوں میں بنٹا ہوا تھا۔ پہلا طبقہ، پیٹریسینس (Patricians) کہلاتا تھا جو امرا اور زمینداروں کا طبقہ تھا۔ دوئم طبقہ پلیبینس (Plebians) کہلاتا تھا جس سے مراد عوام کا طبقہ تھا جو مزدوروں، کاشتکاروں، تاجروں اور فوجیوں پر مشتمل تھا۔ ان دونوں کے مابین آپسی کشمکش چلتی رہتی تھی۔ عوامی طبقہ کے افراد استحصال کا شکار تھے نتیجتاً وہ امراء طبقہ کے خلاف اپنے حق کے لئے ہمیشہ بر سر پیکار رہتے تھے۔ بالآخر 454 قبل مسیح میں ان کے حقوق اور مراعات کی تفویض کے لئے قوانین وضع کیے گئے۔ یہ قوانین لکڑی کی تختیوں پر کندہ کیے گئے جو ''12 تختیوں کے قوانین'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

اٹلی پر حکمرانی قائم کرنے کے بعد سلطنت روم کے حکمراں، سلطنت کی توسیع پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں ان کی افریقہ کے شمالی ساحل پر آباد کارتھیج شہر کے فونیشیائی حکمرانوں کے ساتھ رسّہ کشی شروع ہوئی۔ کارتھیج اور روم کے مابین سسلی پر بالادستی قائم کرنے کے لئے جنگ ہوئی۔ اس جنگی سلسلہ کو (Punic War) کہا جاتا ہے۔ روم کی سیاست اور معیشت پر مسلسل جنگوں اور فتوحاتی مہمات کے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے۔ مفتوحہ علاقوں سے لاکھوں باشندے غلام بنا کر لائے گئے جس کی وجہ سے روم کا سماج دو طبقوں، غلاموں اور مالکوں میں منقسم ہو گیا۔ غلاموں کا بڑے پیمانے پر استحصال ہونے لگا جس کی وجہ سے غلاموں کی مزاحمتی تحریک اور بغاوت کا نیا دور شروع ہو گیا۔ غلاموں کی بغاوت کو ختم کرنے میں جولیس سیزر نے اہم کارنامہ انجام دیا۔ سیاسی اقتدار پر بالادستی نے اس کو تاناشاہ بنا دیا اور یہی اس کے قتل

کا باعث بھی بنا۔ 37 قبل مسیح میں سیزر کا بھتیجا آکٹاویس بر سر اقتدار آیا۔ اس نے آگسٹس (Augustus) یعنی عظیم فاتح جرنیل اور پرنسپ (Princep) یعنی اوّل شہری کا لقب اختیار کیا۔ اسی نسبت سے اس کی حکومت کو پرنسپیٹ (Principate) کہا جاتا تھا۔ آگسٹس نے ایک بڑی سلطنت قائم کر کے اصلاحات کا آغاز کیا اور سلطنت میں امن وامان قائم کیا لیکن اس کے بعد روم میں ظالم حکمرانوں کے دور کا آغاز ہوا اور ان حکمرانوں نے تمام جمہوری روایات کو پامال کر دیا۔ شہنشاہ مطلق العنانیت اور خود مختاری کا شکار ہو گئے جس کے نتیجہ میں روم کی سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی کے اختتام پر سلطنت روم زوال پذیر ہو کر دو حصّوں میں منقسم ہو گئی: اوّل مشرقی سلطنت اور دوئم مغربی سلطنت کہلائی۔ کونسٹینٹائن نے مشرقی سلطنت میں قدیم بازنطین کے مقام پر اپنا نیا دارالخلافہ قسطنطنیہ میں قائم کیا۔ یہی مشرقی سلطنت بطور بازنطینی سلطنت کئی صدیوں تک قائم ودائم رہی۔ پانچویں صدی میں مغربی حصہ پر وحشی قوموں نے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں مغربی رومی سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور بالآخر 476ء میں مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

سلطنت روم کے زوال پر سب سے مستند کتاب ایڈورڈ گبّن کی تصنیف سلطنت روم کا زوال *Decline and Fall of the Roman Empire* مانی جاتی ہے۔ اس میں مورخ نے مسیحی چرچ کے عروج کو سلطنت روم کے زوال کی سب سے اہم وجہ بتایا ہے۔ مارکس کا ماننا ہے کہ غلامی کے خاتمہ سے اس سلطنت کا زوال ہوا۔ بیسویں صدی کے روسی مصنف مائیکل روشووزیف نے سلطنت کے زوال کے لئے ''سماجی کشیدگی'' کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اس کے مطابق اقتدار اور معاشی حقوق سے محروم طبقے اور حکمراں طبقے کے مابین مراعات حاصل کرنے کی جدوجہد کو اہم وجہ بتایا ہے۔ مورخ ودالبینک نے غلامی کی رسم کو زوال کی اہم وجہ قرار دیا ہے کیونکہ اس نے ''سائنٹیفک طرز فکر اور فکری توانائی'' کو مفلوج کر دیا تھا۔ اطالوی مورخ مزارینو کا ماننا ہے کہ غیر مستحکم معاشی حالات ومعاشی بدانتظامی اور ادارہ جاتی تنزلّی کے باعث سلطنت روم زوال کا شکار ہوئی۔ مشہور مورخ ٹائنبی کا ماننا ہے کہ داخلی اور خارجی دونوں وجوہات کی بنا پر سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ کچھ مورخ ''فوجی بحران'' کو اس زوال کا سبب مانتے ہیں کیونکہ جرمن قبائلیوں کے حملہ نے سلطنت روم کو سیاسی انتشار کا شکار بنا دیا جس کی وجہ سے سلطنت زوال کا شکار ہو گئی۔

جاگیر دارانہ نظام میں معاشرہ بنیادی طور پر دو طبقوں میں منقسم تھا۔ پہلا طبقہ زمینداروں جاگیرداروں کا تھا اور دوسرا کسانوں/زرعی پیشہ ور افراد پر مشتمل تھا۔ کسانوں کو مزدوری کے بغیر جاگیرداروں کے کھیتوں پر کام کرنا پڑتا تھا اور پیداوار بازار کے بجائے مقامی طور پر کھپت کے لیے کی جاتی تھی۔ تجارت ابھی ایک منظم معاشی ادارہ کے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی۔ یورپ کے مختلف ممالک میں اس نظام میں تضاد کے باوجود کئی مشابہت بھی پائی جاتی تھیں جس میں کسانوں کا استحصال ہر جگہ یکساں اور نمایاں تھا۔ یورپ میں سلطنت روم کے زوال کے بعد غلاموں کو اکٹھا کر کے ان سے زراعت میں بیگار کرانے کی روایت نے جنم لیا۔ یورپ کے علاوہ یہ نظام ایشیا کے کئی علاقوں میں مختلف نوعیت اور خصوصیت کے ساتھ رونما ہوا۔ بعض مورخین بالخصوص آر۔ ایس شرما کا ماننا ہے کہ ہندوستان میں بھی یورپ کی طرز پر جاگیر دارانہ نظام قائم ہوا۔ کیونکہ یہاں شہری مراکز کے زوال کے ساتھ ساتھ تجارتی سرگرمیوں کا زوال ہوا اور بالآخر لوگ شہری علاقوں سے نکل کر دیہی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ جو دیہی معیشت کی علامت تھی۔ ہندوستان میں زمیندار طبقہ کسانوں کی پیداوار کا ایک بڑا بطور لگان وصول

کرتا تھااوران سے بیگار بھی کراتا تھا۔ اگرچہ سماجی اور معاشی اعتبار سے یہ جاگیر دارانہ نظام کا ہی ایک حصّہ تھا مگر کسانوں کی حالت یورپ کے غلاموں جیسی نہیں تھی۔ مورخین کا ماننا ہے کہ ''عہد وسطیٰ کے سماجی نظام میں جاگیر داری ایک نمایاں خصوصیت تھی۔''

2.3 جاگیر دارانہ نظام کا مفہوم و مطلب

جاگیر داری کی اصطلاح ''جاگیر'' سے بنی ہے۔ جس کا مطلب امراء کو ان کی خدمات کے بدلے زمین کے کسی حصّہ کی ملکیت تفویض کرنا تھی۔ گیارہویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک یورپ میں ایک انوکھا نظام تھا جس کو جاگیر دارانہ نظام کہا جاتا تھا۔ 'فیوڈل' لفظ 'فیوڈ' سے مشتق ہے جس کا مطلب خدمت کے بدلے زمین کی ملکیت عطا کرنا تھا۔ زمینداروں کو ان کی فوجی اور دیگر خدمات کے بدلے جو زمین ان کی ملکیت/ تحویل میں تفویض کی جاتی تھی اس بندوبست کو جاگیر دارانہ نظام کہا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا انوکھا نظام تھا جس میں سماجی، سیاسی اور معاشی سبھی اختیارات زمین کی ملکیت سے وابستہ تھے۔ ''یہ زمین کی ملکیت سے متعلق ایک مکمل تنظیم تھی جس میں بادشاہ سے لے کر سب سے کم تر درجہ کا زمیندار بھی ایک دوسرے سے خدمت کے فریضے سے باہم وابستہ تھے۔'' ارجن دیو کے مطابق کسی ''جاگیر دارانہ معاشرے میں زمین بھی طاقت کا ذریعہ تصور کی جاتی تھی۔'' اس کی ابتدا بتدریج مگر رفتہ رفتہ ہوئی۔ اس کا وجود کسی شاہی فرمان کے ذریعہ عمل میں نہیں آیا، یا پھر کسی حکمراں نے رائج نہیں کیا بلکہ خود بخود وجود میں آیا۔ اس کی ابتدا غیر یقینی اور سیاسی مشکلات اور انتشار کے نتیجے میں ہوئی۔ مسلسل جنگوں اور کسی مضبوط اور منظم حکومت کی غیر موجودگی کے باعث جاگیر دارانہ نظام کو ترقی کا موقع ملا۔ مینا کشی پھوکن کا خیال ہے کہ ''جاگیر دارانہ نظام اور اس کا طرز عمل پورے یورپ میں یکساں نہیں تھا۔ کچھ ممالک پوری طرح سے اس کی گرفت میں تھے مثلاً فرانس، لیکن جرمنی میں جاگیر دارانہ نظام کی خصوصیات کم نمایاں تھیں۔''

2.4 جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اور ارتقا

جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا، اس کے ارتقائی منازل اور اس کا زوال یورپ کی تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ باب ہے اور اس پورے عہد کو عہد وسطیٰ (Middle Ages) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مورخین کا ماننا ہے کہ ''عہد وسطیٰ کا پہلا زمانہ جس نے یورپ کو ایک سیاسی، معاشی اور سماجی نظام دیا، اس کی بنیادی ساخت دسویں صدی میں تیار ہوئی۔ پھر آنے والی تین صدیوں میں یہ نظام مکمل ہوا جس کی بنیاد مکمل طور پر زمین پر تھی۔ فرانسیسی جاگیر دارانہ نظام، جاگیر دار کے بغیر کوئی زمین نہیں (No land without Lord) کے قانون پر قائم تھا۔ زمین خالص امرا کی ملکیت تھی جاگیر دارانہ نظام کی سیاسی تشکیل زمین کی ملکیت کے درجہ بند ڈھانچہ سے رونما ہوئی تھی۔

جاگیر دارانہ نظام دنیا کے تمام ممالک میں مختلف عہد میں قائم ہوا۔ اگرچہ ایشیا اور افریقی ممالک میں یہ نظام اہم تبدیلیوں کے ساتھ رونما ہوئی۔ یورپ کے بنسبت افریقی اور دیگر ممالک میں کچھ الگ خصوصیات دیکھنے کو ملتی تھیں۔ یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کا زوال ہو رہا تھا ٹھیک اس وقت دوسرے برِّاعظم میں اس نظام کا قیام ہو رہا تھا۔

ارجن دیو کا خیال ہے کہ ''عہد وسطیٰ کے دوران دنیا میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پرانی بادشاہتوں اور سلطنتوں کے زوال نیز نئی

سلطنتوں کے قیام سے سیاسی نقشہ بدل گیا''مزید وہ لکھتے ہیں کہ ''لیکن سیاسی تبدیلی سے زیادہ اہم سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں تھیں۔ مغربی یورپ پر ان تبدیلیوں کے اثرات زیادہ واضح اور نمایاں تھے۔اس عرصہ میں ان خطّوں میں جو سماجی واقتصادی نظام وجود میں آیا وہ زمانہ قدیم کے سماجی اور اقتصادی نظام سے بہت مختلف تہا''اس عہد میں پہلے مغربی یورپ پھر یورپ کے دوسرے حصّہ میں جو نظام قائم ہوا اسے جاگیر دارانہ نظام کہا جاتا ہے۔اس دور میں ''عوامی زندگی میں شہر اور تجارت کا رول بہت کم تھا''یورپ نہیں شہری زندگی اور تجارت کا زوال دیکھنے کو ملتا ہے وہیں یورپ کے علاوہ دوسرے ممالک شہر اور تجارت کا زوال بہت نمایاں نہیں تھا۔ لیکن یورپ کی طرح دیگر ممالک میں بھی کسانوں کا استحصال عام چلن تھا۔ یورپ میں اس نظام نے غلامی کو جنم دیا لیکن ہندوستان میں اس سے مشابہ نظام قائم تو ہوا لیکن یورپ کی طرح غلامی کا تصوّر دیکھنے کو نہیں ملتا۔

2.5 جاگیر دارانہ نظام کی بنیادی ساخت

جاگیر دارانہ معاشرہ مختلف طبقوں میں منقسم تھا۔امراء پادری اور کسان اس کے تین اہم طبقے تھے۔اس نظام میں تمام دائرۂ اختیارات کا انحصار مقامی روایتوں پر تھا۔ زمینداری عام طور پر فیف یا پھر اجرت (Fee) پر منحصر تھی۔ امراء اور مختلف طبقوں میں معاہدہ پر اس نظام کا دار و مدار تھا۔ اس نظم ونسق میں ہر شخص کو ایک رتبہ حاصل تھا۔ بادشاہ بلند مرتبہ پر فائز ہوتا تھا وہ رؤسا کو جاگیریں دیتا تھا۔ان رؤسا کو ڈیوکس (Dukes) اور ارلس (Earls) کہا جاتا تھا۔ یہ رئیس لوگ اپنی زمینداری کا کچھ حصّہ چھوٹے جاگیر دار جن کو بیرن (Baron) کہا جاتا تھا، تفویض کر دیتے تھے۔اس کے بدلے بیرن فوجی خدمات فراہم کرتے تھے۔ ہر جاگیر دار اپنے سے اعلیٰ مرتبہ والے کو خراج پیش کرتا تھا جس کے بدلے اس کو رسمی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ یورپ میں جاگیر دارانہ نظام مراتب وار/درجہ بندی کے اصول پر قائم تھا۔اس نظام میں ہر ایک درجہ کا جاگیر دار مکمل منصب پر فائز سردار کا تابع دار ہوتا تھا۔اس نظام کی ایک خصوصیت اطاعت پسندی تھی۔ جاگیر دارانہ نظام میں رفتہ رفتہ ذیلی جاگیر داری (Sub-infeudation) کی روایت شروع ہو گئی۔ مثال کے طور پر بادشاہ اپنے سے نیچے کے عہدہ پر فائز ڈیوکس اور ارلس (جن کا تعلق شاہی خاندان سے تھا) کو فیف تفویض کرتا تھا۔ڈیوکس اور ارلس، بیرنس (امرائ) کو جاگیریں فراہم کرتے تھے۔ یہ لوگ جنگ جو سرداروں کو ''فیف'' عطا کرتے تھے۔ سب سے نچلے سطح پر کسان تھے۔ جن کی محنت اور مشقت پر بالائی سطح پر فائز جاگیر داروں کا انحصار ہوتا تھا۔

جاگیر دارانہ نظام میں امرا اور رؤسا کو اگرچہ زمین کی ملکیت حاصل تھی لیکن وہ اپنی اراضی پر کھیتی نہیں کرتے تھے۔ کاشتکاری کی پوری ذمہ داری کسانوں پر عائد تھی۔ کسان یورپ کی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ تھے۔ جاگیر دارانہ نظام میں درجہ بندی کے سب سے نچلے پائیدان پر کسان تھے۔ جو نہ صرف کھیتی کے لئے پابند عمل تھے بلکہ بے گار کے لئے کبھی بھی اور کہیں بھی ان کو حاضر رہنا واجب العمل تھا۔

کسان طبقہ بھی کئی درجوں میں منقسم تھا اور مختلف ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے پابند تھا۔اول ایسے کسان جن کو حق ملکیت حاصل ہوتی تھی اور لگان کی ادائیگی میں اپنی پیداوار کا بڑا حصہ اپنے مالک کو دینے کے لئے ذمہ دار تھے ایسے کسان پر اپنے مالک کے کھیتوں پر بے گار

کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ سوئم کسانوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جو غلاموں کے زمرے میں آتا تھا۔ غلامی اور بے گاران کا مقدر تھا ان کو کسی بھی کام کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً نہر کی کھدائی، سڑکوں کی تعمیر وغیرہ۔ اس کے لئے غلام کسی بھی اجرت کے مستحق نہیں تھے ۔ وہ اپنے مالکوں سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح راہ فرار حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ بھاگنے کی صورت میں سزا کے مستحق ہوتے تھے۔ جاگیر دار خوش ہو کر اگر آزاد کردے تو وہ آزاد زندگی گذارنے کی حق دار تھے۔ اس نظام میں آقا کی وفاداری اصل چیز تھی۔ غلام آقا کا حکم ماننے کا پابند تھا۔ جب بادشاہ کو جنگ کے لئے فوج کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ اپنے تابع جاگیر دار کو تقاضا کرتا۔ وہ اپنے تابع سردار سے فوج کا مطالبہ کرتا تھا اور وہ جنگجو سرداروں سے فوج کا مطالبہ کرتا اور ہر جاگیر دار جنگجوؤں کا دستہ بادشاہ کو فراہم کرتا تھا۔ اسی لئے کچھ مورخین نے جاگیر دارانہ نظام کو فوجی نظام سے تعبیر کیا ہے۔

جاگیر دارانہ نظام کو آگے چل کر موروثی حیثیت حاصل ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد فیف اس کے وارث کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اس طرح فیف موروثی ہو گئی۔ فوجی خدمات کے علاوہ تابعدار (Vassal) مقامی روایت کے مطابق دوسری خدمات انجام دینے کے لئے مجبور تھے۔ یورپی ممالک میں کلیسا نے بھی جاگیر دارانہ نظام کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ کلیسا میں رائج درجہ بندی جاگیر دارانہ نظام میں مروّج تھی۔ کلیسا کے پاس بہت زمین ہوتی جس کو امراء کلیسا کو بطور انعام فراہم کرتے تھے۔

2.6 بطور سیاسی ادارہ جاگیر دارانہ نظام کا کردار

جاگیر دارانہ نظام کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تصنیف سے وابستہ مورخین کو ایم ایم پوستاں (MM Postan) نے اپنی کتاب جاگیر داریت اور اس کا زوال (Feudalism and its Decline) میں دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ اول وہ مورخین جو اس نظام کو بطور سیاسی اور فوجی نظام تصور کرتے ہیں دوئم وہ جو اس کو معاشی نظام کا حصّہ مانتے ہیں ۔ زمین پر جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ سیاسی انتظامی اور انصاف سے متعلق اختیارات بھی جاگیرداروں کے دائرۂ اختیار میں تھا۔ مارک بلوک ایک دوسرا مورخ ہے جس نے یورپی جاگیر دارانہ نظام کے بنیادی خصوصیات میں کسانوں اور ان کی ''فیف'' کا تذکرہ کیا ہے۔ انیسویں صدی میں جاگیر دار سیاسی اور منصفانہ اختیارات حاصل کرنے میں کچھ حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ اس سیاسی اختیار کے بدولت ان کو فوجی اور معاشی قوت پر قدرے اختیار حاصل ہو گیا۔ سلطنت روم کے زوال کے بعد مرکزی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ مقبوضہ علاقوں کی حکمرانی اور بادشاہت باثر لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار کی تقسیم (Parcellisation of Sovereignty) کا آغاز ہو گیا۔ جاگیر دارانہ نظام میں شاہی اختیارات میں کمی آئی اور سیاسی مرکزیت کا خاتمہ ہوا۔ جاگیر دار اپنے اپنے علاقوں پر بالادستی قائم کر چکے تھے۔

2.7 جاگیر دارانہ نظام کا معاشی پہلو

مارکس اور مارکسی دانشوروں نے جاگیر دارانہ نظام کو سیاسی اور سماجی نظام بتایا ہے اس نظام میں زمین کی آمدنی دولت کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ تھی۔ اس نظام میں جنس کی ادلا بدلی کا نظام (Barter System) رائج تھا۔ تحفہ اور مال غنیمت کے ذریعہ بھی دولت

حاصل کی جاتی تھی۔مارکرس اس نظام کو سماجی ترتیب (Social Order) کہتا ہے جس کی خصوصیت دوسرے سماجی عناصر پر بالادستی کا قیام تھا۔ جاگیر دارانہ نظام کو یورپ میں جلد ہی موروثی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جاگیر بڑے لڑکے کو منتقل ہو جاتی تھی۔اور وہی حقیقی جانشین ہوتا تھا۔ جاگیر دار کے دوسرے لڑکے بھی جاگیر دار ہوتے تھے اور تابعدار کے لڑکے تابعدار ہوتے تھے۔ سماجی درجہ بندی ہندوستانی معاشرہ میں مروجہ ذات پات کے نظام کی طرز پر قائم تھی۔ جس میں حد درجہ سختی تھی کسی کو بھی اپنے طبقہ سے نکل کر دوسرے طبقے میں شمولیت کا اختیار نہیں تھا۔ جس طبقہ میں پیدا ہوتا تھا اسی طبقہ سے پوری زندگی منسلک رہتا تھا۔

جاگیر دار کو حق ملکیت حاصل ہوتی تھی لیکن وہ اپنی زمین پر کاشت نہیں کرتے تھے۔ کاشتکاری کسانوں کی ذمہ داری تھی اور جاگیر دارانہ نظام کی درجہ بندی میں وہ سب سے نچلے پائیدان پر تھے۔کسان یورپ کی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ تھے۔کسان بھی کئی طبقوں میں منقسم تھے۔ اوّل طبقہ میں وہ کسان شامل تھے جن کو جاگیرداروں نے براہِ راست زمین تفویض کی تھی۔ اور اس اراضی پر کسان کو حق ملکیت حاصل تھی وہ بے گار کرنے کے لئے مجبور نہیں تھے۔ لیکن ان کو مقررہ لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے زمرے میں زیادہ تر وہ کسان شامل تھے جن کو اپنی پیداوار کا کچھ حصّہ اپنے سردار کو دینا پڑتا تھا۔ تیسرے زمرے میں کسانوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ جو غلاموں کے زمرے میں شامل تھے۔کچھ غلاموں کے پاس اگرچہ اپنی زمین ہوتی تھی پھر بھی ان کو جاگیرداروں کے کھیتوں پر بے گاری کرنی پڑتی تھی۔ان کو کھیتی کے علاوہ دوسرے بے گار کاموں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا مثلاً سڑکوں کی تعمیر، نہروں کی کھدائی، جنگلوں کی صفائی وغیرہ۔اس بے گاری کے لئے وہ کسی اجرت کے حقدار نہیں تھے۔ جاگیر دار سے حاصل شدہ زمین کا کچھ حصّہ بطور معاوضہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ غلاموں پر یورپ میں کئی قسم کی پابندیاں بھی عائد تھیں۔ زمین کی ملکیت تبدیل ہونے پر وہ دوسرے کی ملکیت میں چلے جاتے تھے۔ وہ زمین سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ کسی بھی خلاف ورزی کی صورت میں ان کو قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ کسانوں کا استحصال عام بات تھی۔ آزادی کا تصور ناممکن تھا۔ غلامی ان کا مقدر تھی۔

2.8 جاگیر دارانہ نظام کی خصوصیات

جاگیر دارانہ نظام بنیادی طور پر سلطنت روم میں قائم سیاسی اداروں اور سماجی رسم و رواج کے اُصولوں پر قائم تھا۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں جاگیر دارانہ نظام میں مقامی سیاست، سماجی تہذیبی روایات اور معاشی عناصر دیکھنے کو ملتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس میں کچھ یکسانیت بھی پائی جاتی تھی۔

1. اوّل: جاگیر دارانہ نظام میں یہ تصور عام تھا کہ خدا نے بادشاہ کو ملک عطا کیا ہے اور وہ اس کا مالک ہے۔ بادشاہ اس زمین کا کچھ حصّہ اپنے امراء میں تقسیم کر دیتا تھا ایسے امراء کو تابعدار (Vassals) کہا جاتا تھا۔ یہ امراء پھر اپنی زمین کا کچھ حصّہ دوسرے جاگیرداروں کو تفویض کر دیتے تھے۔ یہ نظام مکمل طور پر مخروطی ساخت پر قائم تھا۔ دوسرے زمرے کے امراء کو ڈیوک یا ارلس کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی زمین کا کچھ حصہ دوسرے نچلے درجہ کے امراء کو تفویض کر دیتے تھے جن کو بیرنس کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ پھر اپنی زمین کا کچھ حصہ دوسرے نچلے طبقہ کو دے دیتے تھے سب سے نچلا طبقہ نائٹ (Knights) کہلاتا تھا ان کے نیچے کوئی جاگیر دار نہیں

ہوتا تھا۔اس درجہ بندی میں سب سے نیچے زرعی غلام (Serfs) ہوتے تھے جو بے گار مزدور ہوتے تھے۔ جن کے پاس کھیتی نہیں ہوتی تھی لیکن جس کھیت پر وہ کھیتی کرتے تھے اسی سے وابستہ ہوتے تھے۔ جاگیر دارانہ نظام میں زراعت کو فوقیت حاصل تھی اور تمام کمائی اور سیاسی رشتوں کا دارومدار اسی پر تھا۔

2. دوئم : جاگیر دار کو اپنی ملکیت پر مکمل اختیار حاصل تھی۔اس زمین پر رہائشی کاشتکاروں سے ٹیکس وصول کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ امراء اور ان کے نچلے طبقے کے رؤسا کے کچھ حقوق و فرائض بھی تھے۔ جب کسی تابعدار پر کوئی حملہ آور ہوتا تو اس کی مدافعت اور تعاون کرنا بڑے جاگیر دار (Lord) کی ذمہ داری تھی۔ عدالت میں انصاف کی پاسبانی بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ تابعدار کے اہل خانہ کی نگہبانی بھی اس کے ذمے تھی۔اس کے بدلے تابعدار کو اپنے آقا کے تئیں بھی کچھ واجبات کی ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً آقا کے بچّے کی شادی کے موقع پر نقد رقم فراہم کرنا پڑتی تھی یا پھر تابعدار کی موت کے بعد وراثت منتقل ہونے پر اس کو وراثتی ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جب جاگیر دار اس کے علاقے میں جاتا یا پھر ادھر سے گذرتا تو اس کے استقبالیہ یا پھر قیام کا خرچ برداشت کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ طاقتور مضبوط مرکزی حکومت کے عدم موجودگی میں جاگیر دار ہی سب سے طاقتور اور مطلق انسان ہوتا تھا۔

3. سوئم : جاگیرداروں کی اپنی فوج ہوتی تھی۔ان کو نائٹ (Knight) کہا جاتا تھا۔ مستقل فوج کے قیام کا کوئی اہتمام نہیں تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر تابعدار کو فوجی ٹکڑی مہیا کرنی ہوتی تھی۔ نوجوانوں کو کھیل اور سیر بینی کے ذریعہ فوجی تربیت ملتی تھی اور جنگ کے دوران ان کی خدمات بطور فوجی حاصل کی جاتی تھی۔

4. چہارم : اس نظام میں جاگیر دار امراء اپنے آپ کو سب سے طاقتور اور اعلیٰ تصور کرتے تھے یہ بہت ہی شان و شوکت والی زندگی بسر کرتے تھے۔ امرا طبقہ کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ لگان اور دوسرے مختلف ابواب تھے۔ عام لوگ امرا کے کھیتوں پر کام کرتے تھے جن کو عام زبان میں Serfs کہا جاتا تھا۔اس طبقہ کو پیداوار کا زیادہ تر حصہ ان امراء کو دینا پڑتا تھا۔ غلاموں کی طرح ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔امراء اپنی مرضی کے مطابق ان کا استحصال کرتے تھے۔

5. پنجم: تعلقہ داری نظام (Manorial System) عہد وسطیٰ کے یورپی سماج کی ایک اہم معاشی ساخت تھا۔امیر اپنے گڑھی یا تعلقہ (Manor) پر رہتا تھا جو معاشی اور سماجی زندگی کا محور تصور کیا جاتا تھا اور اپنے تابعداروں کو زمین تفویض کرتا تھا زمینی عطیہ کا یہ سلسلہ اس کے ایک خاص ٹکڑے کے مالک (Seignior) تک چلا جاتا تھا جس کے پاس ایک گڑھی (Manor) ہوتا تھا بقول میناکشی پھوکن یہ مقامی زراعتی نظام، گڑھی یا تعلقہ داری کے نظام پر قائم تھا۔اس کو استعمال کرنے کی اجازت کے بدلے ان کو اپنے آقا کے لئے کچھ نجی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں۔ عام طور پر یہ لوگ لگان جنس میں ادا کرتے تھے لیکن بعد میں ان کو نقدی میں ادائیگی کرنا پڑتی تھی۔''

2.9 جاگیر دارانہ نظام کی خوبیاں

مورخین نے جاگیر دارانہ نظام کی خوبیوں پر اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ اس نظام میں بہت سی خامیاں موجود تھیں۔ لیکن اس کی خوبیاں بھی نمایاں طور پر ظاہر تھیں۔ جاگیر دارانہ نظام نے لوگوں کو اس وقت تحفظ فراہم کیا جب یورپ میں غیر یقینی صورت حال تھی کیونکہ کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ یورپ میں اس نظام نے نظم و نسق قائم کر کے لوگوں کو تحفظ اور انصاف فراہم کیا۔ اس نے عام انسانوں کو سیاسی اور سماجی تحفظ فراہم کر کے معاشرہ میں امن قائم کیا۔ امرا عوام الناس کو ان کے مشکل حالات میں مدد فراہم کرتے تھے اور رفاہی کاموں میں ترجیحی بنیاد پر حصہ لیتے۔

جاگیر دارانہ نظام نے عوام میں اخلاقی قدروں مثلاً وفاداری، شجاعت، سخاوت، عاجزی، انکساری، خوش مزاجی جیسے خصائل پیدا کر کے معاشرہ کو تہذیب و تمدن سے آشنا کیا۔ امرا اپنے تابعدار سے محبت اور التفات کا مظاہرہ کرتے جبکہ تابعدار اپنی وفاداری اور رواداری کا مظاہرہ کرتے۔ جاگیر دارانہ نظام نے اخلاقی اور سماجی قدروں کو فروغ دے کر تہذیبی وراثت کی بہترین مثال پیش کی۔ عورتوں کو سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کا حق بھی تھا۔ جاگیر دارانہ نظام آقا یا امیر (Lords) اور تابعدار (Vassal) کے معاہدہ کے اصول پر قائم تھا جس میں ہر طبقہ کو اپنے حقوق اور فرائض کے تئیں وفادار اور سختی سے پابند بنایا۔ بادشاہ جاگیر دارانہ قوانین کی عمل آوری کا پابند تھا۔ ان اُصولوں نے بادشاہ کو مطلق العنان بننے سے باز رکھا۔

جاگیر دارانہ نظام کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ بادشاہ کو اپنے ماتحت امرا کی حمایت اور تعاون پر انحصار کرنا پڑتا تھا جس سے بادشاہ کی حیثیت کم ہوتی گئی اور امرا نسبتاً طاقتور ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلینڈ میں امرا نے انگلینڈ کے بادشاہ جان کو 1215 میں میگنا کارٹا (Magna Carta) پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا۔ جاگیر دارانہ نظام نے بلاشبہ خود مختار ریاستوں کے عروج کا راستہ ہموار کیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ جاگیر دارانہ نظام کے کچھ مختار کل جاگیر داروں نے اپنی حیثیت اور طاقت کا مظاہر کرتے ہوئے اپنی سلطنت کی توسیع شروع کر دی اور انہوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے ایک طاقتور ریاست قائم کر لی مثلاً نورمنڈی کے ڈیوک نے 1066 میں انگلینڈ پر قبضہ کر لیا اور اس کے جانشینوں نے برطانوی سلطنت قائم کر لی۔ اسی طرح فرانس میں ہیوکاپے (Hugh Capet) کے جانشینوں نے فرانسیسی سلطنت قائم کی۔ برانڈن برگ کے مارگریٹ نے پرشیا کی سلطنت اور ہیپسبرگ کے رڈولف نے آسٹریا کی طاقتور سلطنت قائم کر کے جاگیر دارانہ نظام کی بنیادوں کو کمزور کر دیا۔ جو تیرہویں صدی میں زوال کا شکار ہو گئی۔

2.10 جاگیر دارانہ نظام کی خامیاں

جیسا کہ ہم جانتے ہیں جاگیر دارانہ نظام کے قیام سے ہی اس میں کچھ موروثی خامیاں بھی تھیں اگرچہ اس نظام کے بدولت یورپ میں امن اور استحکام قائم ہو سکا لیکن اس کی خامیاں مثلاً اس نے کسی مرکزی حکومت کو قائم کرنے میں رخنہ ڈالا جس کے بدولت یورپ میں کئی صدیوں تک کوئی مضبوط و مستحکم مرکزی حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ کچھ امرا اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ وہ بادشاہ تک کی پرواہ نہیں کرتے

تھے۔ وہ اپنی فوج رکھتے تھے اپنا سکّہ جاری کرتے تھے اور بادشاہ کو فوجی تعاون کے لئے ان پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ جاگیر دارانہ نظام میں Fief صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں دیا جاتا تھا بلکہ یہ موروثی بنیادوں پر منتقل ہوتا تھا جس کی وجہ سے درجہ بندی قائم رہی۔ جاگیر دارانہ نظام میں طبقاتی کشمکش کی وجہ سے ہمیشہ جنگ چلتی رہتی تھی جس کی وجہ سے عام انسان اور کسان بہت پریشان اور غربت کا شکار ہو گئے۔ جنگوں کی وجہ سے ایک طرف زراعت تباہ و برباد ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف تجارت اور صنعت کی ترقی رک گئی۔ جنگی صورت حال اس وقت تک قائم رہی جب تک طاقتور بادشاہ کا وجود عمل میں نہیں آ گیا۔ جنگ کی وجہ سے تہذیبی و ثقافتی ترقی مثلاً تعلیم، ادب اور دیگر فنون لطیفہ کو بھی مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

2.11 جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے وجوہات

جاگیر دارانہ نظام کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط تھی۔ عام طور پر مورخین اس کے عروج کا زمانہ 11 ویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک مانتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے آخری عشرے میں فرانس اور اٹلی میں اس کا زوال شروع ہو گیا اور پندرہویں صدی میں مکمل طور پر اس نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن مورخین کی اتفاق رائے ہے کہ اس کے کچھ عناصر اور ادارے اٹھارویں صدی تک کسی نہ کسی صورت میں قائم و دائم رہے۔ جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے مختلف عوامل ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

اوّل: جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے متعلق مورخین کی ایک متفقہ رائے یہ ہے کہ اس نظام میں موروثی خامیاں موجود تھیں جس کے بدولت یہ روبہ زوال ہوا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں وقت کے ساتھ Vassals بہت طاقتور ہوتے چلے گئے جب بادشاہ نے اپنی حیثیت اور طاقت کا مظاہرہ کیا اور ماتحت اُمراء کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش میں وجود میں آنے والے نئے متوسط طبقہ نے بادشاہ کی بھرپور حمایت کی۔ یورپ میں وجود میں آنے والا نیا طبقہ تاجروں اور کاروباری پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو دولت مہیا کرائی اور اس کی مدد سے بادشاہ نے اپنی فوج تیار کی۔ اس کی مدد سے آزاد مزاج کے حامل باغی امراء کو کنٹرول کرنے میں بادشاہوں نے کامیابی حاصل کر لی۔ بارود اور توپ کی ایجاد نے جنگی طرز کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ توپ اور بارود کی مدد سے باغی امراء کے قلعوں کو مسمار کر کے بادشاہوں نے ان کو اپنے ماتحت کر لیا۔ جنگی طور طریقہ میں تبدیلی بھی زوال کی وجہ مانی جاتی ہے۔

دوئم: کچھ مورخین کا خیال ہے کہ تجارتی ترقی اور اس کی توسیع جاگیر دارانہ نظام کی سب سے اہم تھی۔ تجارتی سرگرمیوں نے پیسے کی معیشت (Money Economy) کو جنم دیا۔ مورس ڈاب نے اپنی کتاب میں اس نظام کے زوال کی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جاگیر دارانہ نظام بنیادی طور پر ایک فطری معیشت تھی جو تجارت اور پیسہ کے لین دین کے بڑھنے کی وجہ سے کمزور ہو کر تباہ و برباد ہو گئی۔ اب بازار کے لئے پیداوار کو فوقیت دی جانے لگی۔ خدمات کے بجائے نقدی کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا۔ اس طرح مقامی معیشت (Local Economy) کی جگہ پیسے کی معیشت رائج ہو گئی۔ جس نے پیداوار کے نظم کو تبدیل کر دیا۔ حکمراں، روایتی کاشتکاری کی جگہ جدید اور بڑے پیمانے پر زرعی پیداوار کی اہمیت پر توجہ دینے لگے۔

ہنری پیرین(Henri Pitren)کاخیال ہے کہ ''بارہویں صدی سے دوردراز کے علاقوں سے تجارت کی شروعات نے نہ صرف تجارت بلکہ زراعت کو بھی متاثر کیا۔اس نے بحیرہ روم کی تجارت کو فروغ دیا جس کی وجہ سے تجارت کو ترقی ملی۔انگلینڈ میں اس کی وجہ سے بازاری معیشت(Market Economy)کو ترقی ملی جس نے سرمایہ داری نظام کی ابتدا کی راہ ہموار کی اور جاگیر دارانہ معیشت کو اثر انداز کیا جس کا براہ راست نتیجہ اس کے زوال سے جڑا تھا۔ جاگیر دارانہ نظام کا بحران اس وقت مزید شدّت اختیار کر گیا جب یورپ میں بارہویں صدی کے ابتدائی عشرے میں مہنگائی بڑھنے لگی جو تیرہویں صدی کے ابتدائی عشرے تک قائم ہی۔امراء کو زمینوں کے بٹوارے کے ساتھ مختلف قسم کے لگان اور دوسرے ٹیکس کی ادائیگی کے لئے کسان کو قرض دینا پڑتا تھا۔اس وقت مہاجن ان کو قرض دیتے تھے اس طرح مہاجن دیہی معیشت پر اثرانداز ہو کر کسانوں کا استحصال کرنے لگے۔ جس کی بدولت بحران مزید بڑھتا چلا گیا۔

سوئم: یورپ میں شہروں کے عروج سے بھی جاگیر دارانہ نظام غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ تجارت کے فروغ کی وجہ سے Serf آزاد ہو گئے اور ان کو شہروں میں زندگی گذارنے اور روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔ جاگیر دارانہ قانون کے مطابق کوئی بھی Serf کی غیر حاضری کی وجہ سے کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ مورخین کا ماننا ہے کہ تیرہویں صدی کے یورپ میں دیہی معیشت بحران کا شکار ہو گئی جس کے بدولت وہاں کی آبادی میں غیر متوقع کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ آبادی میں یہ کمی یورپ میں 1348ئ میں طاعون پھیلنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔طاعون کے دوران یورپ کی ایک بہتر بڑی آبادی لقمہ اجل بن گئی۔اس کو وبائے طاعون (Black Death) کہا جاتا ہے۔اس نے Serf کی قوت مول تول (Bargaining Power) کو بڑھا دیا جس کے بدولت جاگیر دارانہ نظام کمزور پڑنے لگا۔مارک بلوک کے مطابق جاگیر دارانہ نظام اچانک زوال پذیر نہیں ہوا بلکہ رفتہ رفتہ مختلف عوامل کے بدولت زوال کا شکار ہوا۔اس نے نئے سماجی طبقہ کے ظہور، شہروں کا عروج اور تجارت کی ابتدا کو جاگیر دارانہ نظام میں تبدیلی کو پیش خیمہ بتایا۔وہ مزید لکھتا ہے کہ پیسہ کی بڑھتی ہوئی اہمیت، تجارت میں توسیع اور مارکیٹ اکونومی کی ابتدا نے جاگیر دارانہ نظام کی سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں کو متاثر کیا جس کے بدولت اس نظام کی بنیادیں کمزور ہوئیں۔ مارک بلوک نے زراعت کے میدان میں بڑھتے ٹیکنالوجی کے استعمال سے پیداوار میں اضافہ کو بھی اس کے زوال کا ایک اہم وجہ مانا ہے۔ نیز یہ کہ مارک بلوک طبقاتی کشمکش کو جاگیر دارانہ سماج کی کمزوری کی ایک اہم وجہ بتاتا ہے۔

روڈنی ہلٹن مشرقی یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے لئے اس کی معاشی زندگی میں بحران کو اہم وجہ بتاتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ چھوٹے کسانوں نے جاگیر دارانہ نظام کے استحصال سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنی پیداوار کو بڑھانا شروع کر دیا جس سے اضافی پیداوار میں گراں قدر اضافہ ہوا اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف جگہ جگہ کسانوں کی بغاوت پھوٹ پڑی۔ان لوگوں کو بغاوت کا حوصلہ بڑھتے ہوئے تجارتی لین دین اور مارکیٹ اکونومی سے ملا۔ بدلتے ہوئے طرز پیداوار(Mode of Production)نے پرانے جاگیر دارانہ نظام کی بنیاد کو کمزور کر دیا جو بالآخر پندرہویں صدی میں زوال کا شکار ہو گئی۔ کسانوں کے کئی طبقات مثلاًامیر کسان جن کو کلک(Kulak)کہا جاتا تھا،ایک اہم سماجی طبقہ کے طور پر ابھر کر آیا جس نے پیداوار کے نظام میں مزید تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ قومی بادشاہوں کے عروج کی وجہ سے جاگیر دارانہ نظام کا زوال ہوا کیونکہ بادشاہوں کا مقام بلند و بالا تصور کیا جانے لگا۔انہوں نے اپنی

پوزیشن کومزید مستحکم کرکے اپنی قوت اور عظمت میں گراں قدر اضافہ کیا۔ جس کی وجہ سے جاگیر دار اور امرا کی پوزیشن کمزور ہوئی۔ بادشاہت کے نئے تصور، حق خداداد (Devine Right) نے بادشاہ کی پوزیشن اور عظمت مستحکم ہوئی۔ اس نئے نظریہ کے تحت بادشاہ کے تئیں وفاداری عوام کے لئے ایک اہم فریضہ قرار دے دیا گیا۔ انگلینڈ میں پارلیامنٹ کے قیام نے جاگیر دارانہ نظام کی جڑوں کو کمزور کر دیا کیونکہ بادشاہ اور عوام کے درمیان ریاست ایک مضبوط کڑی بن گئی۔

مورخین کی متفقہ رائے ہے کہ صلیبی جنگوں نے جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان جنگوں نے قسطنطنیہ اور اسکندریہ اور یورپ کے مابین تجارتی راستہ کو ہموار کیا۔ جس نے (Grand Trade) کے نظریہ کو تقویت بخشی۔ اس کے بدولت تجارت کی ترقی کے ساتھ یورپ میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا جس کے بدولت نئے تجارتی اور صنعتی شہروں کا عروج ہوا۔ شہروں میں رہائش پذیر تاجر اور کاریگروں نے اپنی معاشی حیثیت اور سماجی طاقت کو مستحکم کرکے جاگیر داروں اور امراء سے خود کو آزاد کر لیا جو پرانے نظام کے لئے بہت بڑا چیلنج ثابت ہوا۔ اس طرح مقامی بادشاہوں کو اس بااثر نئے طبقہ نے معاشی اور اخلاقی تعاون دے کر بادشاہت کے ادارہ کو مزید مضبوط اور خود مختار بنا دیا۔ جو اپنی منظم فوج رکھنے کی اہلیت کے بدولت پہلے سے زیادہ بارسوخ ہو گئے۔ اپنی حفاظت اور ملک کی مدافعت میں اس طبقہ کی فوجی قوت نے بادشاہ کو پرانے فرسودہ نظام سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی کے ساتھ تعلیم کی ترویج واشاعت نے لوگوں کو فرسودہ جاگیر دارانہ نظام کی غلامی کی زنجیر کو توڑنے کا حوصلہ عطا کیا۔ مارکسی ماہر معاشیات پال سوئزی (Paul Sweezy)، ہنری پیرین کے طویل ساختی تجارت کے نظریہ کو ہی جاگیر دارانہ نظام کے زوال کا اہم سبب مانتا ہے۔ دوسرے دور جدید کے مورخین نے بھی تجارت کی توسیع اور نئے تجارتی اور صنعتی مراکز کے ظہور کو زوال کا اصل ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مورخین سرمایہ داری نظام کی ابتدا اور اس کی توسیع کو جاگیر دارانہ نظام کی بقا کے لئے نقصان دہ مانتے ہیں اور کچھ حد تک اس کے زوال کی وجہ بھی۔

2.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

یورپ میں جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اس کی توسیع اور زوال یورپ کی تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع رہا ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اور اس کے زوال کی وجوہات آج بھی مورخین کے مابین مباحثہ کا اہم موضوع ہے۔ تاریخ نویسی کے مختلف مکتبہ فکر کے دانشوروں نے تاریخی شواہد کی بنیاد پر اپنا مطالعہ پیش کیا ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ اس باب میں سلطنت روم کے زوال سے لے کر جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا اور اس کی سیاسی، سماجی اور معاشی ساخت پر مدلّل گفتگو شامل ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کا سیاسی، سماجی اور معاشی پہلو کا مورخین کی تحقیق و تصنیف کی روشنی میں تنقیدی جائزہ اس باب میں پیش کیا ہے۔ بطور ادارہ جاگیر دارانہ نظام مختلف اَدوار سے گذرا جس میں مقامی اور علاقائی عناصر شامل ہوتے گئے جس نے اس کو تقویت بخشی۔ اس کی تاریخ کئی صدیوں پر مشتمل ہے اور مورخین نے اس کو دو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور نویں صدی سے لے کر گیارہویں صدی تک اور دوسرا گیارہویں صدی سے لے کر چودہویں صدی تک مانا جاتا ہے۔ بالآخر چودہویں صدی میں جاگیر دارانہ نظام میں غیر معمولی تبدیلی آنے لگی۔ جس کی وجہ سے اس کے سیاسی، سماجی اور معاشی ساخت میں تبدیلی آنے لگی۔ طبقاتی جدوجہد نے اس کے سماجی ساخت اور تانے بانے کو کمزور کر دیا وہیں معاشی تبدیلیوں مثلاً تجارت کی توسیع

کی وجہ سے مارکیٹ اکونوی، پیسہ کی اہمیت جس کو مورخین پیسے کی معیشت کہتے ہیں وغیرہ نے جاگیردارانہ نظام کی معاشی ساخت کو چیلنج کرنا شروع کردیا۔ پھر زراعت میں ٹیکنالوجی کے استعمال نے پیداوار کے نظام کو انقلابی حد تک تبدیل کردیا۔ جس کی وجہ سے جاگیردارانہ نظام زوال پذیر ہوگیا سیاسی طور پر مقامی بادشاہوں کے عروج کے سیاسی سطح پر کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مثلاً بادشاہوں نے اپنی مستقل فوج رکھ لی جس کی بدولت جاگیردار امراء کی پوزیشن اثرانداز ہوگئی۔ انہوں نے خداداد حقکے نظریہ پر عمل پیرا ہوکر اپنے آپ کو مستحکم کرکے اپنی قوت کو بہت بڑھالیا۔ اس کے علاوہ بارود کی ایجاد نے جاگیردارانہ نظام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور اس سے جاگیرداروں کے قلعوں کو مسمار کرکے ان کو جنگ میں شکست دینا بہت آسان ہوگیا۔ اسی کے ساتھ نیا سیاسی اور معاشی نظام منظر عام پر آیا جس نے یورپ کی تاریخ کا منظر نامہ بالکل تبدیل کردیا اور یہ نیا نظام سرمایہ داری کا نظام تھا۔

2.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

لیتی فنڈیا (Latifundia) : قدیم روم میں وسیع اراضی جس پر غلام یا مزدور کھیتی کرتے تھے۔

امارت (Principate) : شہنشاہوں کا راج جس میں کچھ جمہوری طریقے موجود تھے۔

پیونک (Punic) جنگیں : قدیم روم اور کارتھیج کے درمیان لڑی گئی تین جنگوں کا سلسلہ۔ ان جنگوں کو پیونک جنگ اس لیے کہا جاتا ہے کیوں کہ کارتھیج کے لوگ فنیشیائی (Phoenician) یا پیونک کہلاتے تھے۔

منشور کبیر : منشور کبیر (Magna Carta) ، برطانوی بادشاہ کے ذریعہ جاری کیا جانے والا وہ دستاویز تھا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ خود بادشاہ بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔

حق خداداد : (Divine Right) :اس سے مراد یہ ہے کہ بادشاہ یا حکمران کو اس کے اختیارات خدا کی جانب سے حاصل ہوتے ہیں۔

2.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جاگیردارانہ نظام (Feudal System) کیا تھا؟

(الف) تجارتی نظام (ب) صنعتی نظام

(ج) زمین کی ملکیت اور باہمی وفاداری پر مبنی سماجی و سیاسی نظام (د) جمہوری نظام

2. جاگیردارانہ نظام بنیادی طور پر کہاں رائج تھا؟

(الف) چین (ب) ہندوستان (ج) یورپ (د) مصر

3. مغربی سلطنتِ روم کا زوال کس صدی میں ہوا؟

(الف) چوتھی صدی (ب) پانچویں صدی (ج) چھٹی صدی (د) ساتویں صدی

4. سلطنتِ روم کے زوال کی اہم وجہ کیا تھی؟

(الف) قدرتی آفات (ب) بربر اقوام کے حملے (ج) صنعتی انقلاب (د) صلیبی جنگیں

5. جاگیر دارانہ نظام کے اہم اجزا کون سے تھے؟

(الف) بادشاہ، فوج اور تاجر (ب) آقا، تابعدار اور زرعی غلام (ج) علماء، تاجر اور سپاہی (د) کلیسا، تاجر اور غلام

2.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جاگیر دارانہ نظام کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کے مختلف نظریات کیا ہیں؟
2. جاگیر دارانہ نظام کی اہم خصوصیات پر تبصرہ کیجئے۔
3. مقامی بادشاہت کی ابتدا نے جاگیر دارانہ نظام کو کس طرح نقصان پہنچایا۔

2.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جاگیر دارانہ نظام کے زوال کے وجوہات پر تنقیدی تبصر کیجئے۔
2. جاگیر دارانہ نظام کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیاتی جائزہ پیش کیجئے۔
3. جاگیر دارانہ نظام کے ماتحت فوجی نظام پر مدلّل نوٹ لکھیئے۔

جوابات: 1۔(ج) زمین کی ملکیت اور باہمی وفاداری پر مبنی سماجی و سیاسی نظام 2۔(ج) یورپ 3۔(ب) پانچویں صدی

4۔(ب) بربر اقوام کے حملے 5۔(ب) آقا، تابعدار اور زرعی غلام

اکائی 3۔ ریاست اور کلیسا: عہد وسطیٰ کا یورپ

(State and Church in Medieval Europe)

اکائی کے اجزاء

3.0	تمہید
3.1	مقاصد
3.2	ریاست اور کلیسا: تصور، تعریف اور تاریخی پس منظر
3.3	مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد کلیسا کا عروج
3.4	پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات
3.5	تعیناتی کا تنازع
3.6	پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم
3.7	کینوسا کا واقعہ
3.8	صلیبی جنگیں اور ریاست و کلیسا
3.9	پاپائیت کا عروج و زوال
3.10	قومی بادشاہتوں کا ابھار
3.11	اکتسابی نتائج
3.12	کلیدی الفاظ
3.13	نمونہ امتحانی سوالات
3.13.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.13.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.13.3	طویل جوابات کے حامل سوالات

3.0 تمہید (Introduction)

یورپ کی عہد وسطیٰ (Medieval Europe) تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک کے ایک طویل تاریخی دور پر محیط ہے۔ اس عرصے میں یورپ کی سیاسی، مذہبی، سماجی اور معاشی زندگی پر دو بڑی طاقتوں کا گہرا اثر رہا : ریاست (State)اور کلیسا(Church) ۔ان دونوں اداروں کے درمیان تعلق کبھی تعاون پر مبنی رہا، کبھی شدید رقابت اور تصادم کی صورت اختیار کر گیا۔ یہی کشمکش عہد وسطیٰ کی سیاست، قانون، تعلیم، معاشرت اور تہذیب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔476ء میں مغربی رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد یورپ سیاسی انتشار اور غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہو گیا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف جرمن قبائل نے یورپ کے مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا۔اس سیاسی خلا میں کلیسا ایک منظم اور مستحکم ادارے کے طور پر سامنے آیا۔ چونکہ عوام مذہبی اعتبار سے کلیسا سے وابستہ تھے،اس لیے کلیسا نہ صرف مذہبی رہنمائی فراہم کرتا تھا بلکہ سماجی، تعلیمی، عدالتی اور سیاسی امور میں بھی اہم کردار ادا کرنے لگا۔

روم کا بشپ، جو بعد میں پوپ (Pope) کے نام سے مشہور ہوا، رفتہ رفتہ پورے مغربی یورپ کے مسیحیوں کا روحانی پیشوا بن گیا۔ کلیسا کا دعویٰ تھا کہ اس کا اختیار براہِ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت پطرس (Saint Peter) سے منتقل ہوا ہے، لہٰذا تمام مسیحی حکمرانوں کو مذہبی معاملات میں پوپ کی اطاعت کرنی چاہیے۔ دوسری طرف یورپ کے بادشاہ اور شہنشاہ اپنی سیاسی خود مختاری برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت چلانے، حکام کی تقرری، ٹیکس وصول کرنے اور قوانین نافذ کرنے کا اختیار صرف ریاست کے پاس ہونا چاہیے۔ اسی اختلاف نے کئی صدیوں تک ریاست اور کلیسا کے درمیان اقتدار کی کشمکش کو جنم دیا۔

عہد وسطیٰ کے اس دور میں ایک ایسا سیاسی نظریہ وجود میں آیا جس کے مطابق خدا نے دنیا کی رہنمائی کے لیے دو الگ الگ ادارے قائم کیے ہیں: ایک روحانی رہنمائی کے لیے کلیسا اور دوسرا دنیاوی نظم و نسق کے لیے ریاست۔ لیکن عملی طور پر دونوں ادارے اپنی اپنی حدود سے آگے بڑھنے لگے۔ پوپ خود کو بادشاہوں سے برتر سمجھنے لگا جبکہ شہنشاہ اپنے آپ کو خدا کا نمائندہ قرار دے کر مذہبی معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگا۔ یہی کشمکش بعد میں تعیناتی کے تنازع(Investiture Controversy) ، کینوسا کے واقعے، صلیبی جنگوں اور قومی ریاستوں کے ابھار جیسے اہم تاریخی واقعات کی بنیاد بنی۔ عہد وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ریاست اور کلیسا کے تعلقات کا مطالعہ ناگزیر ہے، کیونکہ اسی تعلق نے یورپ کے سیاسی اداروں، قانونی نظام، جامعات، تعلیم، مذہبی اصلاحات اور بعد ازاں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور اصلاحِ مذہب (Reformation) جیسی عظیم تحریکوں کی راہ ہموار کی۔

3.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ

- ریاست اور کلیسا کے بنیادی تصورات کو سمجھ سکیں گے۔

- مغربی رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد کلیسا کے عروج کی وجوہات بیان کر سکیں گے۔
- پوپ اور یورپی بادشاہوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- تعیناتی کے تنازع (Investiture Controversy) کی وجوہات اور نتائج بیان کر سکیں گے۔
- پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان اختلافات کی وضاحت کر سکیں گے۔
- کینوسا کے واقعے کی تاریخی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔
- صلیبی جنگوں کے سیاسی اور مذہبی اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- پاپائیت کے عروج اور زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- قومی ریاستوں کے ابھار میں کلیسا کے کردار کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔

3.2 ریاست اور کلیسا: تصور، تعریف اور تاریخی پس منظر

ریاست اور کلیسا دو ایسے ادارے ہیں جنہوں نے عہد وسطیٰ کے یورپ کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اگرچہ دونوں کا مقصد انسانی معاشرے کو منظم رکھنا تھا، لیکن ان کے دائرۂ اختیار، ذمہ داریوں اور اقتدار کی نوعیت میں واضح فرق موجود تھا۔ ریاست سے مراد وہ سیاسی ادارہ ہے جو کسی مخصوص علاقے میں قانون نافذ کرتا ہے، امن و امان قائم رکھتا ہے، ٹیکس وصول کرتا ہے، عدالتی نظام چلاتا ہے اور بیرونی حملوں سے ملک کا دفاع کرتا ہے۔ ریاست کے سربراہ کو مختلف ادوار میں بادشاہ، شہنشاہ یا فرمانروا کہا جاتا تھا۔ اس کے برعکس کلیسا ایک مذہبی ادارہ تھا جو مسیحی عقائد، عبادات، اخلاقی تعلیمات اور مذہبی قوانین کی نگرانی کرتا تھا۔ کلیسا کا اعلیٰ ترین سربراہ پوپ تھا، جسے پوری مغربی مسیحی دنیا کا روحانی رہنما تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے ماتحت بشپ، آرچ بشپ، پادری اور راہب خدمات انجام دیتے تھے۔

ابتدائی مسیحیت کے دور میں کلیسا صرف مذہبی سرگرمیوں تک محدود تھا، لیکن چوتھی صدی میں شہنشاہ قسطنطین اعظم کے عہد میں مسیحیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت ملنے کے بعد کلیسا کی حیثیت میں نمایاں تبدیلی آئی۔ اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، وسیع زمینیں عطا کی گئیں اور مذہبی رہنماؤں کو سیاسی معاملات میں بھی اہم مقام ملا۔ وقت گزرنے کے ساتھ کلیسا یورپ کا سب سے منظم ادارہ بن گیا۔ اس کے پاس تعلیم یافتہ افراد، منظم انتظامیہ، مالی وسائل اور وسیع اراضی موجود تھی۔ یہی عوامل اسے سیاسی اعتبار سے بھی طاقتور بناتے گئے۔ کلیسا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام اقتدار کا سرچشمہ خدا ہے اور چونکہ پوپ خدا کا نمائندہ ہے، اس لیے دنیا کے تمام مسیحی حکمرانوں کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ دوسری جانب بادشاہ اس تصور کو مکمل طور پر قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ اپنی حکومت کو خدا کی عطا کردہ ذمہ داری تو سمجھتے تھے، لیکن اپنے سیاسی اختیارات میں کلیسا کی مداخلت کو مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

اسی اختلاف نے عہد وسطیٰ کی سیاست کو ایک مستقل کشمکش میں مبتلا رکھا۔ کبھی دونوں ادارے ایک دوسرے کے معاون ثابت ہوئے، مثلاً بیرونی حملوں یا صلیبی جنگوں کے دوران، اور کبھی دونوں ایک دوسرے کے شدید مخالف بن گئے، جیسا کہ تعیناتی کے تنازع کے

دوران ہوا۔ ریاست اور کلیسا کے تعلقات کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ دونوں عوام کی وفاداری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہ سیاسی اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے جبکہ کلیسا مذہبی اطاعت کو اولین حیثیت دیتا تھا۔ اس دوہری وفاداری نے یورپی معاشرے میں کئی پیچیدہ مسائل کو جنم دیا، جن کے اثرات کئی صدیوں تک برقرار رہے۔

3.3 مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد کلیسا کا عروج

(Rise of Church after the Decline of Western Roman Empire)

476ء میں مغربی رومی سلطنت کے خاتمے نے یورپ کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ رومی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد پورے مغربی یورپ میں سیاسی انتشار، معاشی بحران اور انتظامی کمزوری پیدا ہو گئی۔ مختلف جرمن قبائل نے سابقہ رومی علاقوں پر قبضہ کر لیا، لیکن ان کے پاس ایسا منظم انتظامی ڈھانچہ موجود نہیں تھا جو رومی سلطنت کی جگہ لے سکتا۔ اسی صورتحال میں کلیسا ایک مستحکم ادارے کے طور پر سامنے آیا۔ اگرچہ حکومتیں بدلتی رہیں، لیکن کلیسا کی تنظیم، مذہبی تعلیمات اور انتظامی ڈھانچہ برقرار رہا۔ عوام کو انصاف، تعلیم، عبادت اور سماجی مدد کے لیے کلیسا ہی سب سے قابلِ اعتماد ادارہ نظر آنے لگا۔ راہب خانوں (Monasteries) نے اس دور میں علم و ادب کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ قدیم یونانی اور رومی کتابوں کی نقل تیار کی جاتی، مذہبی تعلیم دی جاتی اور بیماروں، مسافروں اور غریبوں کی خدمت کی جاتی۔ اس طرح کلیسا نہ صرف مذہبی بلکہ علمی اور سماجی مرکز بھی بن گیا۔ روم کے بشپ کی حیثیت بھی بتدریج مضبوط ہوتی گئی۔ چونکہ روم قدیم رومی سلطنت کا دارالحکومت رہ چکا تھا، اس لیے وہاں کے بشپ کو خصوصی احترام حاصل تھا۔ بعد میں یہی منصب پوپ کے نام سے معروف ہوا اور اس نے پورے مغربی یورپ پر اپنا روحانی اثر قائم کر لیا۔ آٹھویں صدی میں فرینک بادشاہ شارلیمان (Charlemagne) نے کلیسا کی سرپرستی کی اور 800ء میں پوپ لیو سوم نے اسے "رومیوں کا شہنشاہ" قرار دے کر تاج پہنایا۔ اس واقعے نے ریاست اور کلیسا کے تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ایک طرف پوپ نے خود کو بادشاہوں کو قانونی حیثیت عطا کرنے والا قرار دیا، تو دوسری طرف بادشاہ کلیسا کی سرپرستی کر کے اپنی حکومت کو مذہبی جواز فراہم کرنے لگے۔

3.4 پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات (Relationship between the Pope and the Emperor)

عہدِ وسطیٰ کے یورپ کی سیاسی تاریخ میں پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد اگرچہ یورپ متعدد چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا، لیکن مذہبی اعتبار سے مغربی عیسائی دنیا ایک ہی روحانی مرکز یعنی روم کے پوپ کے زیرِ اثر تھی۔ دوسری جانب مختلف یورپی بادشاہ اور بعد ازاں مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) کے شہنشاہ سیاسی اقتدار کے نمائندہ تھے۔ ان دونوں اداروں کے تعلقات ابتدا میں باہمی تعاون پر مبنی تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اقتدار کی کشمکش میں تبدیل ہو گئے۔ ابتدائی دور میں پوپ اور بادشاہ ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ بادشاہ اپنی حکومت کو مذہبی جواز دینے کے لیے پوپ کی تائید حاصل کرتے تھے، جبکہ کلیسا اپنے مذہبی اداروں کے تحفظ اور تبلیغ کے لیے شاہی سرپرستی پر انحصار کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں اداروں نے

ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھا۔

اس تعلق کی سب سے نمایاں مثال شارلیمان (Charlemagne) کی تاج پوشی ہے۔800ء میں کرسمس کے موقع پر پوپ لیوسوم نے روم میں شارلیمان کو 'رومیوں کا شہنشاہ' قرار دے کر اس کے سر پر تاج رکھا۔اس تقریب نے یہ تصور مضبوط کیا کہ شہنشاہ کی قانونی حیثیت پوپ کی منظوری سے وابستہ ہے۔اگرچہ شارلیمان خود ایک طاقتور حکمران تھا، لیکن پوپ کی جانب سے تاج پوشی نے اس کے اقتدار کو مذہبی تقدس عطا کیا۔یہ واقعہ بعد کی صدیوں میں ایک اہم سیاسی نظریے کی بنیاد بنا۔پوپ کا خیال تھا کہ چونکہ وہ خدا کے نمائندے کی حیثیت رکھتا ہے،اس لیے وہ بادشاہوں کو اقتدار عطا بھی کر سکتا ہے اور ان سے واپس بھی لے سکتا ہے۔دوسری طرف شہنشاہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کی حکومت براہِ راست خدا کی عطا کردہ ہے، لہٰذا انہیں اپنے اقتدار کے لیے پوپ کی منظوری کی ضرورت نہیں۔

دسویں اور گیارہویں صدی تک مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ یورپ کے مختلف علاقوں میں بشپ(Bishops)اور ایبٹ (Abbots)مقرر کرتے تھے۔چونکہ یہ مذہبی عہدیدار وسیع زمینوں اور دولت کے مالک ہوتے تھے،اس لیے ان کی تقرری سیاسی اعتبار سے بھی نہایت اہم تھی۔شہنشاہ اپنے وفادار افراد کو ان عہدوں پر مقرر کر کے کلیسا پر اپنا اثر ورسوخ قائم رکھتے تھے۔دوسری جانب کلیسا کے اصلاح پسند رہنماؤں کا خیال تھا کہ مذہبی عہدیداروں کی تقرری صرف کلیسا کا حق ہے۔ان کے نزدیک دنیاوی حکمرانوں کی اس عمل میں مداخلت مذہبی اصولوں کے خلاف تھی۔یہی اختلاف بعد میں تعیناتی کے تنازع (Investiture Controversy) کی صورت اختیار کر گیا، جس نے یورپ کی سیاست کو کئی دہائیوں تک متاثر کیا۔

پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات میں ایک اور اہم پہلو "دو تلواروں کا نظریہ (Doctrine of the Two Swords) " تھا۔اس نظریے کے مطابق خدا نے دنیا کی رہنمائی کے لیے دو اختیارات عطا کیے ہیں: ایک روحانی اختیار، جو کلیسا کے پاس ہے، اور دوسرا دنیاوی اختیار، جو بادشاہوں کے پاس ہے۔لیکن عملی طور پر دونوں ادارے اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے، جس کے نتیجے میں متعدد سیاسی اور مذہبی تنازعات پیدا ہوئے۔

3.5 تعیناتی کا تنازع (Investiture Controversy)

عہد وسطیٰ کے یورپ میں ریاست اور کلیسا کے درمیان سب سے مشہور اور فیصلہ کن تنازع تعیناتی کا تنازع (Investiture Controversy) تھا۔یہ تنازع بنیادی طور پر اس سوال کے گرد گھومتا تھا کہ بشپ اور دیگر اعلیٰ مذہبی عہدوں پر تقرری کا اختیار کس کے پاس ہونا چاہیے: پوپ کے پاس یا شہنشاہ کے پاس؟ تعیناتی (Investiture) سے مراد وہ رسمی تقریب تھی جس میں کسی بشپ یا ایبٹ کو اس کے مذہبی منصب کی علامت کے طور پر انگوٹھی اور عصا (Ring and Staff) عطا کیے جاتے تھے۔ابتدائی عہد وسطیٰ میں یہ رسم اکثر بادشاہ یا شہنشاہ ادا کرتے تھے، کیونکہ بشپ صرف مذہبی رہنما ہی نہیں بلکہ جاگیر دار اور ریاستی منتظم بھی ہوتے تھے۔

وقت کے ساتھ اس نظام میں کئی خرابیاں پیدا ہو گئیں ۔ بعض حکمران مذہبی عہدے فروخت کرنے لگے، جسے سیمونی (Simony) کہاجاتاہے۔اسی طرح کئی مرتبہ مذہبی قابلیت کے بجائے سیاسی وفاداری کی بنیاد پر بشپ مقرر کیے جاتے تھے۔اس صورتحال سے کلیسا کے اندر اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ گیارہویں صدی میں اصلاح پسند پوپوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ مذہبی عہدوں کی تقرری صرف کلیسا کا حق ہے۔ان کے نزدیک کوئی دنیاوی حکمران کسی بشپ کو مذہبی اختیارات نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ اختیار صرف خدا اور اس کے نمائندے یعنی پوپ کو حاصل ہے۔اس اصلاحی تحریک کا نقطۂ عروج پوپ گریگوری ہفتم (Gregory VII) کے دور میں آیا۔انہوں نے 1075ء میں واضح طور پر اعلان کیا کہ کوئی بادشاہ یا شہنشاہ مذہبی عہدوں پر تقرری نہیں کرے گا۔اسی نظریے کو انہوں نے اپنے مشہور دستاویز *Dictatus Papae* میں بیان کیا، جس میں پوپ کے اختیارات کو انتہائی بلند مقام دیا گیا۔ شہنشاہ ہنری چہارم نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ اگر وہ بشپ مقرر کرنے کا اختیار کھو دیتا تو اس کی سیاسی طاقت بھی کمزور ہو جاتی۔ یوں کلیسا اور ریاست کے درمیان ایک کھلا تصادم شروع ہو گیا۔ یہ تنازع صرف مذہبی مسئلہ نہیں تھا بلکہ یورپ کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ بھی اسی سے وابستہ تھا۔ اگر پوپ کامیاب ہوتا تو کلیسا کی برتری قائم رہتی،اور اگر شہنشاہ کامیاب ہوتا تو ریاست مذہبی معاملات پر بھی غالب آجاتی۔اس لیے پورے یورپ کی نظریں اس کشمکش پر مرکوز تھیں۔

3.6 پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم

تعیناتی کے تنازع کا سب سے نمایاں مرحلہ پوپ گریگوری ہفتم اور مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان پیش آیا۔دونوں غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل، مضبوط ارادے رکھنے والے اور اپنے اپنے اختیارات کے سخت محافظ تھے۔ پوپ گریگوری ہفتم کلیسا کی اصلاح اور اس کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ان کا مقصد کلیسا کو دنیاوی حکمرانوں کے اثر ورسوخ سے آزاد کرنا تھا۔ان کے نزدیک مذہبی ادارہ کسی بھی سیاسی قوت سے بالاتر ہونا چاہیے۔دوسری جانب ہنری چہارم جرمن ریاستوں کو متحد رکھنے اور شاہی اقتدار کو مضبوط بنانے میں مصروف تھا۔اس کے لیے بشپ اور دیگر مذہبی عہدیدار اہم سیاسی معاون تھے۔اس لیے وہ ان کی تقرری کا اختیار کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

1076ء میں ہنری چہارم نے جرمنی کے بعض بشپوں کی مدد سے پوپ گریگوری ہفتم کو معزول قرار دینے کی کوشش کی۔اس اقدام کے جواب میں پوپ نے ہنری کو کلیسا سے خارج (Excommunication) کر دیا۔اس سزا کا مطلب یہ تھا کہ اب کوئی بھی عیسائی اس کی اطاعت کا پابند نہیں رہا۔اس فیصلے کے سیاسی نتائج بہت سنگین ثابت ہوئے۔ جرمن امراء، جو پہلے ہی شہنشاہ سے ناخوش تھے، انہوں نے بغاوت شروع کر دی۔ ہنری کو احساس ہوا کہ اگر اس نے پوپ سے صلح نہ کی تو اس کی حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔اسی پس منظر میں تاریخ کا مشہور واقعہ 'کینوسا' پیش آیا، جس نے عہد وسطیٰ میں پوپ کی طاقت کو اپنے عروج پر پہنچا دیا۔

3.7 کینوساکاواقعہ (The Walk to Canossa)

1077ء میں شہنشاہ ہنری چہارم برف پوش آلپس کو عبور کرکے شمالی اٹلی کے شہر کینوسا (Canossa) پہنچا، جہاں پوپ گریگوری ہفتم قیام پذیر تھے۔ روایت کے مطابق ہنری نے تین دن تک قلعے کے باہر سادہ لباس پہن کر، ننگے پاؤں، سخت سردی میں کھڑے ہو کر معافی کی درخواست کی۔ بالآخر پوپ نے اسے معاف کر دیا اور کلیسا سے اخراج کی سزا واپس لے لی۔ کینوسا کا واقعہ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ ایک طاقتور شہنشاہ کو بھی پوپ کے سامنے جھکنا پڑا۔ اس واقعے نے وقتی طور پر کلیسا کی برتری کو ثابت کر دیا اور پورے یورپ میں پوپ کے وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ تاہم یہ تنازع یہیں ختم نہیں ہوا۔ کچھ عرصے بعد ہنری نے دوبارہ اپنی طاقت بحال کی، روم پر حملہ کیا اور ایک نئے پوپ کی تقرری بھی کر دی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست اور کلیسا کے درمیان اقتدار کی کشمکش صرف ایک واقعے سے ختم نہیں ہوئی بلکہ کئی دہائیوں تک جاری رہی۔ بالآخر 1122ء میں معاہدۂ وورمز (Concordat of Worms) کے ذریعے ایک سمجھوتہ طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت مذہبی تقرریوں میں روحانی اختیارات کلیسا کے پاس رہے، جبکہ بعض دنیاوی حقوق ریاست کے پاس برقرار رہے۔ اس سمجھوتے نے اگرچہ تنازع کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا، لیکن ریاست اور کلیسا کے اختیارات کی حدود نسبتاً واضح کر دیں۔

3.8 صلیبی جنگیں اور ریاست و کلیسا (The Crusades and the State and Church)

عہد وسطیٰ میں ریاست اور کلیسا کے تعلقات کو سمجھنے کے لیے صلیبی جنگوں (Crusades) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ صلیبی جنگوں کا بنیادی مقصد بیت المقدس (Jerusalem) اور دیگر مقدس مسیحی مقامات کو مسلم حکمرانوں سے واپس حاصل کرنا تھا، لیکن ان جنگوں نے یورپ میں پوپ، بادشاہوں، جاگیرداروں اور عوام کے باہمی تعلقات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ گیارہویں صدی کے اختتام تک سلجوقی ترکوں نے ایشیائے کوچک کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) مسلسل کمزور ہو رہی تھی۔ بازنطینی شہنشاہ الیکسیوس اول کومنینوس (Alexios I Comnenus) نے مغربی یورپ سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ اس موقع کو پوپ اربن دوم (Urban II) نے پورے یورپ کے عیسائیوں کو متحد کرنے کے لیے استعمال کیا۔

1095ء میں فرانس کے شہر کلرمونٹ (Clermont) میں منعقدہ مذہبی اجتماع میں پوپ اربن دوم نے ایک پرجوش خطاب کیا۔ انہوں نے عیسائیوں سے اپیل کی کہ وہ مقدس سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جو شخص اس مقدس مہم میں شریک ہوگا، اس کے گناہ معاف کیے جائیں گے اور اسے روحانی نجات حاصل ہوگی۔ پوپ کی اس اپیل کا غیر معمولی اثر ہوا۔ ہزاروں جاگیردار، بادشاہ، سپاہی اور عام لوگ صلیبی لشکروں میں شامل ہو گئے۔ پہلی صلیبی جنگ (1096ء تا 1099ء) کامیاب رہی اور بے تحاشہ خونریزی اور قتل عام کے بعد صلیبی فوجوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرکے وہاں لاطینی عیسائی ریاستیں قائم کر دیں۔ صلیبی جنگوں نے پوپ کی حیثیت کو عارضی طور پر بہت مضبوط کر دیا۔ پورے یورپ کے بادشاہ اور امراء ایک مشترکہ مذہبی مقصد کے تحت پوپ کی قیادت قبول کرنے

پر آمادہ ہو گئے۔اس طرح پوپ نہ صرف روحانی رہنما بلکہ بین الاقوامی سیاسی قائد کے طور پر بھی ابھر کر سامنے آیا۔تاہم بعد کی صلیبی جنگیں زیادہ تر ناکام رہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ یورپی بادشاہوں نے محسوس کیا کہ مسلسل جنگوں سے ان کے مالی وسائل اور فوجی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ صلیبی جنگوں کے دوران مختلف بادشاہ اپنے قومی مفادات کو مذہبی مقاصد پر ترجیح دینے لگے، جس سے پوپ کی متحدہ قیادت کمزور پڑ گئی۔

صلیبی جنگوں کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی تھا کہ یورپ کی مختلف ممالک کے ساتھ تجارت میں اضافہ ہوا۔ مشرقی دنیا سے نئے تجارتی سامان، سائنسی معلومات اور ثقافتی اثرات یورپ پہنچے۔اس سے شہروں کی ترقی ہوئی، تاجر طبقہ مضبوط ہوا اور جاگیرداری نظام میں بتدریج تبدیلی آنے لگی۔ یہی تبدیلیاں بعد میں قومی ریاستوں (Nation States) کے قیام کا سبب بنیں۔اس طرح صلیبی جنگوں نے ایک طرف کلیسا کی طاقت کو عروج پر پہنچایا، لیکن دوسری طرف انہی جنگوں نے ایسے معاشی اور سیاسی عوامل کو جنم دیا جنہوں نے مستقبل میں پوپ کے اقتدار کو کمزور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

3.9 پاپائیت کا عروج و زوال (Rise and Decline of the Papacy)

گیارہویں اور بارہویں صدی کو پاپائیت (Papacy) کے عروج کا دور کہا جاتا ہے۔اس زمانے میں پوپ نہ صرف مذہبی معاملات بلکہ یورپ کی سیاست پر بھی نمایاں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔پوپ انوسنٹ سوم (Innocent III) کے دورِ حکومت (1198 تا 1216) کو اس عروج کی انتہا تصور کیا جاتا ہے۔پوپ انوسنٹ سوم کا نظریہ تھا کہ جیسے سورج چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے، اسی طرح کلیسا کی روحانی طاقت دنیاوی حکومتوں سے برتر ہے۔ان کے نزدیک تمام بادشاہوں کو پوپ کی رہنمائی قبول کرنی چاہیے کیونکہ روحانی اختیار دنیاوی اقتدار سے اعلیٰ ہے۔انہوں نے متعدد یورپی بادشاہوں کے معاملات میں براہِ راست مداخلت کی۔انگلینڈ کے بادشاہ جان (King John) کو پوپ کے سامنے جھکنا پڑا اور پوپ کی بالادستی تسلیم کرنی پڑی۔اسی طرح فرانس، جرمنی اور دیگر ریاستوں کے سیاسی معاملات میں بھی پوپ نے اہم کردار ادا کیا۔

پوپ کے اختیارات میں اخراج از کلیسا (Excommunication) اور انٹرڈکٹ (Interdict) جیسے ہتھیار شامل تھے۔ اگر کوئی بادشاہ پوپ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا تو اسے کلیسا سے خارج کر دیا جاتا۔ بعض اوقات پورے ملک میں مذہبی رسومات معطل کر دی جاتیں، جس سے عوام بادشاہ کے خلاف ہو جاتے تھے۔اگرچہ تیرہویں صدی تک پوپ کی طاقت اپنے عروج پر تھی، لیکن اس کے بعد حالات بدلنے لگے۔ یورپی بادشاہوں نے اپنی حکومتوں کو زیادہ منظم بنایا، مستقل فوجیں قائم کیں، ٹیکس کا مؤثر نظام تیار کیا اور مرکزی حکومت کو مضبوط کیا۔اس کے نتیجے میں وہ کلیسا پر کم انحصار کرنے لگے۔اسی دوران فرانس کے بادشاہ فلپ چہارم (Philip IV) اور پوپ بونیفیس ہشتم (Boniface VIII) کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ بادشاہ نے کلیسا پر ٹیکس عائد کیے جبکہ پوپ نے اس کی مخالفت کی۔آخر کار فلپ نے پوپ کو گرفتار کروا دیا، جس سے پاپائیت کی ساکھ کو شدید دھچکا پہنچا۔

1309ء میں پوپ نے روم چھوڑ کر فرانس کے شہر ایویگنون (Avignon) میں رہائش اختیار کی۔ تقریباً ستر برس تک پوپ وہیں مقیم رہے۔اس دور کو ایویگنون پاپائیت (Avignon Papacy) کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس عرصے میں پوپ فرانسیسی بادشاہوں کے زیر اثر نظر آتے تھے، اس لیے ان کی غیر جانبداری اور وقار متاثر ہوا۔اس کے بعد عظیم مغربی اختلاف (Great Western Schism) شروع ہوا، جب ایک ہی وقت میں دو اور پھر تین افراد نے خود کو پوپ قرار دے دیا۔اس داخلی تقسیم نے کلیسا کی وحدت اور اقتدار دونوں کو شدید نقصان پہنچایا۔یوں عہد وسطیٰ کے اختتام تک پاپائیت وہ سیاسی طاقت برقرار نہ رکھ سکی جو اسے بارہویں اور تیرہویں صدی میں حاصل تھی۔

3.10 قومی بادشاہتوں کا ابھار اور کلیسا کی کمزور ہوتی طاقت

(Rise of National Monarchies and the Decline of Church Authority)

عہد وسطیٰ کے آخری دور میں یورپ میں ایک اہم سیاسی تبدیلی رونما ہوئی، جس کے نتیجے میں قومی بادشاہتیں وجود میں آئیں۔ انگلستان، فرانس، اسپین اور پرتگال جیسے ممالک میں مضبوط مرکزی حکومتیں قائم ہوئیں، جنہوں نے جاگیرداروں اور کلیسا دونوں کے اختیارات کو محدود کرنا شروع کر دیا۔ابتدائی عہد وسطیٰ میں یورپی بادشاہ جاگیرداروں اور کلیسا پر انحصار کرتے تھے، لیکن تیرہویں اور چودھویں صدی کے بعد شہروں، تجارت اور معیشت کی ترقی نے بادشاہوں کو نئے مالی وسائل فراہم کیے۔ مستقل ٹیکس، پیشہ ور فوج اور تربیت یافتہ سرکاری اہلکاروں کی بدولت بادشاہوں کی طاقت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ قومی شعور (National Consciousness) بھی اسی دور میں فروغ پانے لگا۔ عوام کی وفاداری آہستہ آہستہ پوپ کی بجائے اپنی قومی حکومتوں کی طرف منتقل ہونے لگی۔ مختلف ممالک کی زبانوں، ثقافتوں اور سیاسی مفادات نے بھی اس رجحان کو تقویت دی۔انگلستان اور فرانس کے درمیان سو سالہ جنگ (Hundred Years' War) نے قومی شناخت کو مزید مضبوط کیا۔اس جنگ نے عوام کو یہ احساس دلایا کہ ان کی پہلی ذمہ داری اپنی ریاست کے ساتھ ہے، نہ کہ کسی بیرونی مذہبی اختیار کے ساتھ۔اسی عرصے میں جامعات (Universities) کے قیام، قانون کی ترقی، شہری زندگی کے فروغ اور تعلیم کے پھیلاؤ نے بھی یورپی معاشرے میں نئی فکری تبدیلیاں پیدا کیں۔ مفکرین نے یہ سوال اٹھانا شروع کیا کہ آیا ریاست کو ہر معاملے میں کلیسا کی اجازت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ان تمام عوامل کے نتیجے میں ریاست اور کلیسا کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہونے لگا۔ اگرچہ کلیسا مذہبی اعتبار سے اب بھی بااثر تھا، لیکن سیاسی معاملات میں بادشاہوں کی خود مختاری مسلسل بڑھتی گئی۔

پندرھویں صدی کے اختتام تک یورپ میں ایک نئی سیاسی سوچ جنم لے چکی تھی، جس میں ریاست کو ایک خود مختار ادارہ سمجھا جانے لگا۔یہی تبدیلی بعد میں نشاۃ ثانیہ، اصلاحِ مذہب اور جدید قومی ریاستوں کے قیام کی بنیاد بنی۔اس طرح عہد وسطیٰ کے اختتام پر ریاست اور کلیسا کے تعلقات میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ ابتدائی دور میں کلیسا سیاسی اقتدار پر غالب تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط بادشاہتوں کے ابھرنے سے ریاست نے اپنی خود مختاری قائم کر لی اور یورپ جدید سیاسی نظام کی طرف گامزن ہو گیا۔

3.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

- ریاست (State) اور کلیسا (Church) کے تصور اور ان کے باہمی تعلقات کو سمجھ سکیں گے۔
- مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد کلیسا کے عروج کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- پوپ اور مقدس رومی شہنشاہوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- تعیناتی کے تنازع (Investiture Controversy) کی وجوہات، اہم مراحل اور نتائج کی وضاحت کر سکیں گے۔
- کینوسا کے واقعہ (1077ء) کی تاریخی اہمیت کو بیان کر سکیں گے۔
- صلیبی جنگوں کے سیاسی، مذہبی اور معاشی اثرات کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔
- پاپائیت کے عروج اور زوال کے اسباب کو سمجھ سکیں گے۔
- قومی بادشاہتوں کے قیام اور کلیسا کی سیاسی طاقت میں کمی کے اسباب کی تشریح کر سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے یورپ میں مذہب اور سیاست کے باہمی تعلق کو جدید یورپی ریاست کے ارتقا کے تناظر میں سمجھ سکیں گے۔

3.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

لفظ/اصطلاح	تاریخی مفہوم
ریاست (State)	ایسا سیاسی ادارہ جو کسی مخصوص علاقے میں حکومت، قانون، عدل اور دفاع کا ذمہ دار ہو۔
کلیسا (Church)	عیسائی مذہبی ادارہ جو مذہبی تعلیمات، عبادات اور روحانی رہنمائی کا مرکز تھا۔
پوپ (Pope)	رومن کیتھولک کلیسا کا اعلیٰ ترین مذہبی پیشوا اور بشپ آف روم۔
مقدس رومی سلطنت	وسطی یورپ کی وہ سلطنت جسے 800ء میں شارلیمان کی تاج پوشی کے بعد نئی حیثیت حاصل ہوئی۔
تعیناتی کا تنازع (Investiture Controversy)	پوپ اور شہنشاہ کے درمیان بشپوں اور دیگر مذہبی عہدیداروں کی تقرری کے اختیار پر ہونے والا تاریخی تنازع۔
اخراج از کلیسا (Excommunication)	پوپ کی جانب سے کسی شخص کو کلیسا کی رکنیت اور مذہبی حقوق سے محروم کر دینا۔
کینوسا (Canossa)	1077ء کا مشہور واقعہ جس میں شہنشاہ ہنری چہارم نے پوپ گریگوری ہفتم سے معافی طلب کی۔
صلیبی جنگیں (Crusades)	1096ء سے 1291ء کے درمیان مقدس سرزمین کے حصول کے لیے یورپی عیسائیوں کی فوجی مہمات۔
پاپائیت (Papacy)	پوپ کا ادارہ اور اس کا مذہبی و سیاسی اقتدار۔
ایوگنون پاپائیت (Avignon Papacy)	1309ء تا 1377ء کا دور جب پوپ روم کے بجائے فرانس کے شہر ایوگنون میں مقیم رہے۔
عظیم مغربی اختلاف (Great Western Schism)	وہ دور جب ایک ہی وقت میں متعدد افراد نے خود کو پوپ قرار دیا۔

قومی بادشاہت (National Monarchy)	ایسی مضبوط مرکزی حکومت جو قومی وحدت، مستقل فوج اور منظم انتظامیہ پر قائم ہو۔

3.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عہد وسطیٰ کے یورپ میں ریاست اور کلیسا دو ایسے ادارے تھے جنہوں نے سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مغربی رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد کلیسا ایک مضبوط اور منظم ادارے کے طور پر ابھرا، جبکہ یورپی بادشاہ سیاسی استحکام قائم کرنے میں مصروف رہے۔ ابتدا میں دونوں کے درمیان تعاون موجود تھا، لیکن جلد ہی اقتدار کی بالادستی کا مسئلہ اختلاف کا باعث بن گیا۔ شارلیمان کی تاج پوشی نے پوپ اور شہنشاہ کے تعلقات کو نئی جہت دی۔ اس کے بعد پوپ نے اپنے آپ کو دنیا کے تمام مسیحی حکمرانوں سے برتر قرار دینا شروع کیا، جبکہ بادشاہ اپنی سیاسی خود مختاری پر زور دیتے رہے۔ یہی اختلاف تعیناتی کے تنازع کی صورت میں سامنے آیا، جس میں پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان شدید کشمکش ہوئی۔ کینوسا کا واقعہ اس تنازع کی علامت بن گیا، اگرچہ بعد میں معاہدۂ وورمز کے ذریعے دونوں کے اختیارات میں کسی حد تک توازن قائم کیا گیا۔ صلیبی جنگوں نے کچھ عرصے کے لیے پوپ کے وقار اور اثر و رسوخ میں اضافہ کیا، لیکن بعد میں انہی جنگوں نے یورپی تجارت، شہروں کی ترقی اور قومی شعور کو فروغ دیا، جس سے بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ ہوا۔ تیرہویں صدی میں پوپ انوسنٹ سوم کے دور میں پاپائیت اپنے عروج پر پہنچی، مگر فلپ چہارم کے ساتھ تنازع، ایویگنون پاپائیت اور عظیم مغربی اختلاف نے اس کے سیاسی اقتدار کو شدید نقصان پہنچایا۔ عہد وسطیٰ کے آخری دور میں قومی بادشاہتوں کے قیام، تجارت کی ترقی، تعلیم کے فروغ اور مرکزی حکومتوں کی مضبوطی نے کلیسا کے سیاسی اثر و رسوخ کو محدود کر دیا۔ اس طرح یورپ میں ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا، جس نے بعد میں نشاۃ ثانیہ، اصلاحِ مذہب اور جدید قومی ریاستوں کی تشکیل کے لیے بنیاد فراہم کی۔

3.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. عہد وسطیٰ میں ریاست اور کلیسا سے بالترتیب کیا مراد ہے؟

(الف) فوج اور پارلیمنٹ (ب) سیاسی حکومت اور مذہبی ادارہ (ج) جاگیر دار اور کسان (د) شہر اور دیہات

2. تعیناتی کے تنازع (Investiture Controversy) کا بنیادی سبب کیا تھا؟

(الف) زمین کی تقسیم (ب) بشپوں اور اعلیٰ مذہبی عہدیداروں کی تقرری کا اختیار

(ج) ٹیکس کا نظام (د) صلیبی جنگوں کی قیادت

3. شہنشاہ ہنری چہارم نے 1077ء میں کس مقام پر پوپ گریگوری ہفتم سے معافی طلب کی تھی؟

(الف) ایویگنون (ب) وورمز (ج) کینوسا (د) کلرمونٹ

4. 1122ء میں کس معاہدے کے ذریعے ریاست اور کلیسا کے درمیان بشپوں کی تقرری کے حوالے سے ایک سمجھوتہ طے پایا؟

(الف) معاہدۂ ٹروائے (ب) معاہدۂ ویسٹ فیلیا (ج) معاہدۂ ورسائی (د) معاہدۂ وورمز

5. وہ دور (1309ء تا 1377ء) جب پوپ روم کے بجائے فرانس میں مقیم رہے، تاریخ میں کیا کہلاتا ہے؟

(الف) عظیم مغربی اختلاف (ب) ایویگنون پاپائیت (ج) کینوسا کا تنازع (د) پاپائیت کا عروج

3.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 476ء میں مغربی رومی سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی انتشار میں کلیسا کس طرح ایک مستحکم اور طاقتور ادارے کے طور پر سامنے آیا؟
2. "دو تلواروں کا نظریہ" کیا تھا اور ریاست و کلیسا کے حوالے سے اس کا کیا مفہوم بیان کیا جاتا تھا؟
3. ایویگنون پاپائیت اور عظیم مغربی اختلاف نے پاپائیت اور کلیسا کی طاقت کو کس طرح نقصان پہنچایا؟

3.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تعیناتی کے تنازع کے تاریخی پس منظر، اس میں پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان کشمکش، اور کینوسا کے واقعے کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. عہد وسطیٰ کے آخری دور میں قومی بادشاہتوں کے ابھار کے کیا اسباب تھے اور ان کے قیام نے کلیسا کی سیاسی طاقت کو کس طرح محدود کر دیا؟

جوابات

1۔(ب) سیاسی حکومت اور مذہبی ادارہ 2۔(ب) بشپوں اور اعلیٰ مذہبی عہدیداروں کی تقرری کا اختیار 3۔(ج) کینوسا

4۔(د) معاہدۂ وورمز 5۔(ب) ایویگنون پاپائیت

اکائی 4۔ گیارہویں سے چودھویں صدی کے دوران یورپی سماج اور معیشت

(European Society and Economy between 11th and 14th Century)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 جاگیر دارانہ نظام اور معاشرتی ڈھانچہ

4.3 زرعی ترقی اور تکنیکی تبدیلیاں

4.4 شہروں کا عروج اور تجارتی احیاء

4.5 گلڈ کا نظام اور دستکاری

4.6 چودھویں صدی کا بحران: طاعون اور کسانوں کی بغاوتیں

4.7 اکتسابی نتائج

4.8 کلیدی الفاظ

4.9 نمونہ امتحانی سوالات

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.0 تمہید (Introduction)

گیارہویں سے چودھویں صدی عیسوی کا دور یورپی تاریخ میں عہد وسطیٰ کے عروج (High Middle Ages) کا انتہائی اہم اور تغیر پذیر دور تصور کیا جاتا ہے۔ یہ وہ تاریخی مرحلہ تھا جب براعظم یورپ، ابتدائی عہد وسطیٰ یا نام نہاد 'تاریک ادوار' (Dark Ages) کے طویل جمود، معاشی بدحالی اور مسلسل عدم استحکام سے نکل کر ایک نئی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی بیداری کی جانب گامزن تھا۔ اس سے قبل کی صدیوں میں یورپ کو بیرونی حملہ آوروں، جن میں شمال سے وائکنگز (Vikings)، مشرق سے میگیارز (Magyars) اور جنوب سے دیگر جنگجو قبائل شامل تھے، کے مسلسل اور تباہ کن حملوں کا سامنا تھا۔ تاہم، گیارہویں صدی کے آغاز تک ان بیرونی حملوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور یورپ میں ایک طویل عرصے کے بعد سیاسی اور سماجی سطح پر ایک نیا استحکام پیدا ہونا شروع ہوا۔ اس استحکام نے ایک ایسے پیچیدہ زرعی اور جاگیردارانہ معاشرے کو پروان چڑھایا جس نے اگلی چند صدیوں تک مغربی تہذیب کی تقدیر کا فیصلہ کیا۔

اس دور کی ایک اور نمایاں خصوصیت ماحولیاتی اور موسمیاتی تبدیلی تھی جسے مورخین 'عہد وسطیٰ کا گرم دور' (Medieval Warm Period) کہتے ہیں۔ اس نسبتاً گرم اور سازگار موسم نے یورپی کسانوں کو زراعت کے لیے ایک بہترین قدرتی ماحول فراہم کیا، جس کے نتیجے میں صدیوں سے بنجر پڑی زمینوں، گھنے جنگلات اور دلدلوں کو صاف کر کے قابل کاشت بنایا گیا۔ زرعی پیداوار میں اس غیر معمولی اضافے نے نہ صرف لوگوں کو بھوک اور قحط سے نجات دلائی بلکہ خوراک کے معیار میں بھی نمایاں بہتری پیدا کی، جس کی وجہ سے آبادی میں حیرت انگیز تیزی سے اضافہ ہوا۔ آبادی کے اس دباؤ اور فالتو زرعی پیداوار نے یورپ میں صدیوں سے مردہ پڑی تجارتی سرگرمیوں کو دوبارہ زندہ کیا اور نئے شہروں کے قیام کی راہ ہموار کی۔

تاہم، ترقی اور خوشحالی کا یہ سفر مستقل اور ہموار نہیں رہا۔ چودھویں صدی کا آغاز اپنے ساتھ کئی ماحولیاتی، معاشی اور وبائی آفتیں لے کر آیا جنہوں نے اس پرانے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے آنے والے قحطِ عظیم (Great Famine) اور اس کے فوراً بعد 1347ء میں پھیلنے والی ہولناک متعدی وبا، جسے طاعونِ عظیم (Black Death) کہا جاتا ہے، نے یورپ کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ ان آفات نے معاشی اور آبادیاتی توازن کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ پورے یورپ میں کسانوں اور مزدوروں کی بغاوتیں پھوٹ پڑیں، جنہوں نے بالآخر روایتی زرعی غلامی (Serfdom) اور جاگیرداری نظام کے زوال پر مہر ثبت کر دی۔ اس اکائی میں ہم اسی پیچیدہ نظامِ زندگی، حیرت انگیز زرعی انقلاب، اور بعد ازاں چودھویں صدی میں رونما ہونے والے ان ہولناک بحرانوں کا انتہائی گہرائی سے تفصیلی جائزہ لیں گے جنہوں نے یورپ کو جدید دور کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے تفصیلی مطالعے کے بعد آپ

- گیارہویں سے چودھویں صدی کے درمیان رائج یورپی جاگیردارانہ نظام کو گہرائی سے سمجھ سکیں گے۔

- عہد وسطیٰ میں ہونے والی شاندار زرعی ترقی، نئی تکنیکی ایجادات کے معاشی اور آبادیاتی اثرات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- یورپ میں شہری مراکز کے دوبارہ عروج، طویل فاصلے کی تجارتی سرگرمیوں کی بحالی اور بینکاری پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- شہری معیشت کو کنٹرول کرنے والے گلڈ سسٹم کے تنظیمی طریقہ کار اور دستکاروں کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- چودھویں صدی کے اواخر میں آنے والے معاشی و آبادیاتی بحران، خاص طور پر طاعونِ عظیم کے تباہ کن نتائج کا تنقیدی مطالعہ کر سکیں گے۔

4.2 جاگیر دارانہ نظام اور سماجی ڈھانچہ (Feudal System and Social Structure)

گیارہویں صدی کے یورپ کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ مکمل طور پر 'جاگیر دارانہ نظام'(Feudalism) اور اس کی معاشی شاخ 'میز نظام'(Manorialism) کے گرد گھومتا تھا۔ جب عظیم رومی سلطنت کا زوال ہوا اور یورپ میں کوئی مضبوط مرکزی حکومت، باقاعدہ نوکر شاہی یا پیشہ ور فوج باقی نہ رہی، تو مقامی سطح پر جان و مال کے تحفظ اور نظم و نسق کی شدید ضرورت نے اس نظام کو جنم دیا۔ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے کمزور کسانوں نے مقامی طاقتور سرداروں کی پناہ لینا شروع کر دی، جس کے بدلے انہوں نے اپنی آزادیاں اور زمینیں ان سرداروں کے حوالے کر دیں۔ اس نظام کے تحت مملکت کا بادشاہ قانونی طور پر تمام زمین کا مالک تصور کیا جاتا تھا، لیکن وہ تنہا اتنے بڑے رقبے کا انتظام نہیں سنبھال سکتا تھا۔ لہٰذا، بادشاہ اپنی مملکت کی زمینیں اپنے طاقتور امراء اور نوابوں (Lords/Nobles) کو فوجی خدمت اور وفاداری کے حلف کے عوض عطا کرتا تھا۔ عطا کی گئی زمین کا یہ حصہ 'فیف'(Fief) کہلاتا تھا۔ یہ امراء اس بات کے پابند ہوتے تھے کہ وہ جنگ کے وقت بادشاہ کو مقررہ تعداد میں مسلح گھڑ سوار فوجی فراہم کریں گے۔ چونکہ یہ امراء بھی اپنی وسیع زمینوں کا انتظام تنہا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ مزید اپنی زمینیں چھوٹے درجے کے جنگجوؤں یا 'نائٹس'(Knights) میں اسی وفاداری اور فوجی خدمت کی شرط پر تقسیم کرتے تھے۔ اس طرح وفاداریوں، وعدوں اور زمین کے تبادلے کا ایک انتہائی پیچیدہ اور درجہ بدرجہ جال بن گیا جو پورے مغربی یورپ پر محیط تھا۔ بادشاہ سے لے کر نچلے ترین نائٹ تک، زمین دینے والا لارڈ (Lord) یعنی آقا اور زمین وصول کرنے والا واسل (Vassal) یعنی ماتحت کہلاتا تھا۔

یورپی سماج روایتی، قانونی اور مذہبی طور پر تین واضح اور انتہائی سخت طبقات میں منقسم تھا، اور ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں منتقل ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ اس تقسیم کو اس وقت کے مفکرین تین حصوں میں بیان کرتے تھے: 'وہ جو عبادت کرتے ہیں'، 'وہ جو جنگ کرتے ہیں'، اور 'وہ جو محنت کرتے ہیں'۔ پہلا طبقہ پادریوں (Clergy) کا تھا، جن کا بنیادی کام مذہب کی تبلیغ، عبادات کی ادائیگی اور معاشرے کی روحانی رہنمائی تھا۔ چرچ اس وقت یورپ کا واحد سب سے بڑا، منظم اور طاقتور ادارہ تھا جس کا معاشرے پر گہرا روحانی، تعلیمی، اور سیاسی غلبہ تھا۔ چرچ کے پاس پورے یورپ کی بہترین زرعی زمینوں کا ایک بہت بڑا حصہ (تقریباً ایک تہائی) تھا اور اسے عوام سے مذہبی ٹیکس (Tithe) وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ دوسرا طبقہ امراء اور جنگجوؤں پر مشتمل تھا، جن کا بنیادی کام جنگ کرنا، علاقوں کا دفاع کرنا اور نظامِ حکومت چلانا تھا۔

اس طبقے کے پاس سیاسی طاقت اور معاشرتی وقار تھا، اور وہ اپنی وسیع جاگیروں پر مکمل حکمرانی کرتے تھے۔ تیسرا اور سب سے بڑا طبقہ، جو کل آبادی کا قریباً نوے فیصد سے زیادہ حصہ بنتا تھا، کسانوں اور زرعی غلاموں (Peasants and Serfs) کا تھا، جن کی مسلسل جسمانی محنت اور استحصال پر پہلے دونوں مراعات یافتہ طبقات اور درحقیقت پورے یورپی معاشرے کی بقا اور عیش و عشرت کا انحصار تھا۔

جاگیرداری کا زمینی اور معاشی پہلو، جس سے عام انسان کا روزمرہ زندگی میں سب سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا، 'مینوریل نظام' کہلاتا تھا۔ یورپ کے طول و عرض میں پھیلے دیہاتوں میں ہر جاگیردار کی اپنی ایک اسٹیٹ ہوتی تھی جسے 'مینور' (Manor) کہا جاتا تھا۔ یہ مینور دراصل ایک مکمل طور پر خود کفیل معاشی اور سماجی اکائی ہوتا تھا جس میں لارڈ کا حفاظتی قلعہ یا حویلی، چرچ، کسانوں کی کچی جھونپڑیاں، مشترکہ چراگاہیں، لکڑی کے لیے جنگلات، پن چکیاں اور وسیع و عریض کھیت شامل ہوتے تھے۔ بیرونی دنیا سے تجارتی روابط کٹے ہونے کی وجہ سے ایک مینور کو خوراک، لباس اور روزمرہ کی ہر ضرورت اپنے ہی وسائل سے پوری کرنی پڑتی تھی۔ ان مینورز پر کام کرنے والے کسانوں کی اکثریت آزاد نہیں تھی بلکہ انہیں 'سرف' (Serfs) کہا جاتا تھا۔ سرف اگرچہ رومی عہد کے روایتی غلاموں کی طرح بازاروں میں زنجیریں پہنا کر خریدے اور بیچے نہیں جاتے تھے، لیکن ان کی حیثیت ایک نیم غلام کی سی تھی کیونکہ وہ قانونی طور پر ہمیشہ کے لیے زمین کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے لارڈ کی پیشگی اجازت کے بغیر نہ تو مینور چھوڑ کر جا سکتے تھے، نہ اپنی مرضی سے شادی کر سکتے تھے، اور نہ ہی اپنا پیشہ بدل سکتے تھے۔ سرفز پر بھاری ذمہ داریاں عائد تھیں۔ انہیں اپنی گزارے کی زمین کاشت کرنے کے بدلے لارڈ کی ذاتی زمین (Demesne) پر ہفتے میں کئی دن (عام طور پر تین دن) بلا معاوضہ جسمانی مشقت کرنی پڑتی تھی جسے 'کوروی' (Corvée) کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی ذاتی فصل کا ایک بڑا حصہ ٹیکس کے طور پر لارڈ کو دینا پڑتا تھا، پن چکی، تندور اور شراب کی مشین استعمال کرنے پر فیس ادا کرنی ہوتی تھی، اور چرچ کو اپنی پیداوار کا دسواں حصہ (Tithe) دینا لازمی تھا۔ ان کی زندگیاں انتہائی کٹھن تھیں، غربت عروج پر تھی، اور وہ جاگیردار کی مقامی عدالتوں کے فیصلوں کے مکمل پابند تھے، جس کی وجہ سے ان کے پاس معاشی آزادی یا کسی قسم کی معاشرتی ترقی کے مواقع سرے سے ناپید تھے۔

4.3 زرعی ترقی اور تکنیکی تبدیلیاں (Agricultural Development and Technological Changes)

گیارہویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی کے اختتام تک، یورپ نے ایک انتہائی خاموش لیکن تاریخ ساز زرعی انقلاب کا مشاہدہ کیا جس نے اس براعظم کی معیشت، معاشرت اور جغرافیے کی مکمل کایا پلٹ دی۔ اس دور میں امن کے قیام اور بیرونی حملوں کے رک جانے کی وجہ سے آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا، جس نے خوراک کی طلب کو بڑھا دیا۔ اس دباؤ کے پیشِ نظر یورپی باشندوں نے ایک وسیع مہم کا آغاز کیا جسے 'مکمل صفائی' (Assarting) کہا جاتا ہے۔ اس مہم کے تحت کسانوں اور راہبوں نے مل کر صدیوں پرانے گھنے جنگلات کی وسیع پیمانے پر کٹائی کی، سمندر کے قریب موجود دلدلوں کو سکھایا، اور بنجر پڑی زمینوں کو صاف کر کے لاکھوں ایکڑ نیا قابلِ کاشت رقبہ تیار کیا۔ اس بے مثال زرعی توسیع میں نئی تکنیکی ایجادات نے کلیدی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا، جنہوں نے انسانی محنت کو مؤثر اور پیداوار کو کئی گنا بڑھا دیا۔ ان تمام ایجادات میں سب سے اہم اور انقلابی ایجاد پہیوں والا 'بھاری لوہے کا ہل' (Heavy Plow) تھا جسے مقامی زبان میں 'کیروکا'

(Carruca) بھی کہا جاتا تھا۔ بحیرہ روم کے خطے کی ریتلی اور نرم مٹی کے برعکس، شمالی اور مغربی یورپ کی مٹی قدرتی طور پر انتہائی سخت، چکنی اور نمی والی تھی۔ پرانا لکڑی کا ہل، جو رومی دور سے چلا آرہا تھا، اس سخت مٹی کی صرف اوپری سطح کو کھرچ سکتا تھا۔ اس نئے بھاری ہل کے آگے لوہے کا ایک تیز پھالا لگا ہوتا تھا جو سخت مٹی کو گہرائی تک کاٹتا تھا، اور اس کے ساتھ لگا ایک تختی نما حصہ مٹی کو الٹ دیتا تھا۔ اس عمل سے زمین کے نچلے حصے کی چھپی ہوئی زرخیزی سامنے آجاتی تھی اور مٹی میں ہوا اور نمی کا تناسب بہتر ہو جاتا تھا، جس سے فصلوں کی پیداوار میں زبردست اضافہ ممکن ہوا۔

اس بھاری ہل کو کھینچنا چند بیلوں کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے ایک اور زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور وہ تھی زراعت میں بیلوں کی جگہ آہستہ آہستہ گھوڑوں کا استعمال۔ گھوڑے بیلوں کے مقابلے میں بہت تیز رفتار اور زیادہ طاقتور ہوتے ہیں، لیکن پرانے طرز کے گلے کے پٹے (Harness) گھوڑے کی گردن پر دباؤ ڈالتے تھے جس سے بھاری وزن کھینچتے وقت اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس مسئلے کا حل گیارہویں صدی میں گھوڑے کی گردن کے گدی دار پٹے (Padded Horse Collar) کی ایجاد کی صورت میں نکلا۔ یہ نیا کاپٹہ گھوڑے کے گلے کے بجائے اس کے کندھوں اور سینے پر دباؤ ڈالتا تھا، جس سے اس کی سانس کی نالی آزاد رہتی تھی اور وہ اپنی پوری جسمانی طاقت استعمال کر کے بھاری سے بھاری ہل انتہائی تیزی سے کھینچ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑوں کے کھروں کو کٹنے سے بچانے کے لیے آہنی نعل (Iron Horseshoes) کا استعمال بھی عام ہو گیا، جس سے گھوڑوں کی کارکردگی اور عمر میں اضافہ ہوا۔ ان تکنیکی ترقیوں کے متوازی، توانائی کے حصول کے متبادل ذرائع بھی تیزی سے مقبول ہوئے۔ پانی اور ہوا کی طاقت سے چلنے والی پن چکیوں اور پون چکیوں (Watermills and Windmills) نے پورے یورپ کے دیہاتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان چکیوں نے اناج پیسنے، لکڑی کاٹنے، چمڑا رنگنے اور اونی کپڑا بننے جیسے تھکا دینے والے کاموں میں انسانی اور حیوانی مشقت کو بے حد کم کر دیا اور پیداواری عمل کو ایک نئی تیز رفتاری عطا کی۔

ان آلات اور مشینوں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ، زمین کی کاشت کے روایتی طریقوں میں بھی ایک انتہائی انقلابی سائنسی تبدیلی رونما ہوئی جسے تاریخ میں، تین کھیتوں کا نظام (Three-Field System) کہا جاتا ہے۔ اس سے قبل صدیوں تک یورپ میں، دو کھیتوں کا نظام (Two-Field System) رائج تھا جس کے تحت کسان اپنی زمین کا صرف آدھا حصہ کاشت کرتے تھے اور باقی آدھا حصہ اس کی کھوئی ہوئی زرخیزی بحال کرنے کے لیے پورا سال خالی (Fallow) چھوڑ دیتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی بھی وقت کل زرعی زمین کا پچاس فیصد حصہ بیکار پڑا رہتا تھا۔ نئے متعارف شدہ 'تین کھیتوں کے نظام' کے تحت کسانوں نے اپنی زمین کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے میں موسمِ خزاں میں سردیوں کی فصل جیسے گندم یا رائی بوئی جاتی جو انسانوں کی بنیادی خوراک تھی۔ دوسرے حصے میں بہار کے موسم میں دلیا (Oats)، جو (Barley)، مٹر یا پھلیاں (Legumes/Beans) کاشت کی جاتیں، جن میں سے گھوڑوں کے چارے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ صرف تیسرا حصہ خالی چھوڑا جاتا تھا، اور ہر سال ان فصلوں کی ترتیب کو گھما دیا جاتا تھا (Crop Rotation)۔

اس نظام کے بے شمار اور دوررس معاشی اور سماجی فوائد مرتب ہوئے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ ہر سال قابل کاشت زمین کا رقبہ 50 فیصد سے بڑھ کر تقریباً 67 فیصد ہو گیا، جس سے مجموعی زرعی پیداوار میں زبردست اچھال آیا اور کسانوں کے پاس ہنگامی حالات کے لیے فالتو اناج بچنے لگا۔ دوسرا اور سب سے بڑا حیاتیاتی فائدہ پھلیوں کی کاشت کی صورت میں نکلا۔ پھلیاں قدرتی طور پر ہوا سے نائٹروجن جذب کر کے اسے مٹی میں شامل کرتی ہیں، جس سے زمین کی زرخیزی قدرتی کھاد کے بغیر ہی بحال ہو جاتی تھی۔ مزید برآں، ان پھلیوں اور مٹروں نے عام یورپی کسان کی روایتی کاربوہائیڈریٹ پر مبنی خوراک میں پروٹین کی ایک بڑی اور سستی مقدار شامل کر دی۔ خوراک کے معیار اور مقدار میں اس غیر معمولی بہتری کے نتیجے میں قحط سالی کے واقعات کم ہو گئے، اموات کی شرح میں کمی واقع ہوئی، اور لوگوں میں بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہوئی۔ بہتر صحت اور طویل عمری کے باعث یورپ کی آبادی میں دھماکہ خیز اضافہ ہوا، جس نے معاشرے میں ایک ایسی نئی معاشی حرکیات اور طلب پیدا کی جس نے بالآخر فالتو مزدوروں اور پیداوار کی بدولت مستقبل کے شہری مراکز اور تجارتی انقلاب کی مضبوط بنیاد رکھی۔

4.4 شہروں کا عروج اور تجارتی احیاء (Rise of Cities and Commercial Revival)

گیارہویں صدی کے بعد زراعت میں ہونے والی غیر معمولی ترقی، نئی زمینوں کی آبادکاری اور 'تین کھیتوں کے نظام' کے باعث یورپی معیشت میں فالتو پیداوار (Surplus Production) کا رجحان پیدا ہوا، جس نے ایک نئے اور متحرک دور کا آغاز کیا جسے تاریخ میں 'تجارتی انقلاب' (Commercial Revolution) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صدیوں سے یورپی معیشت صرف مقامی ضروریات پوری کرنے تک محدود تھی، لیکن اب کسانوں کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ اناج اور خام مال بچنے لگا تھا۔ اس فالتو پیداوار کو منافع بخش قیمت پر فروخت کرنے کے لیے باقاعدہ منڈیوں کی ضرورت پیش آئی۔ ابتدائی طور پر یہ منڈیاں مقامی قلعوں، بڑی خانقاہوں اور دریاؤں کے کناروں پر لگنا شروع ہوئیں، جہاں کسان اپنی زرعی پیداوار لاتے اور دستکار اپنی بنائی ہوئی روزمرہ کی اشیا فروخت کرتے تھے۔ ان تجارتی سرگرمیوں کے مسلسل بڑھنے سے پرانے اور ویران رومی شہر دوبارہ آباد ہونے لگے، اور تجارتی شاہراہوں، قدرتی بندرگاہوں اور آبی گزرگاہوں کے سنگم پر نئے شہری مراکز تیزی سے ابھرنے لگے۔ یہ نیا شہری عروج یورپ کے دو مختلف خطوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھا: جنوب میں اٹلی کے شہر اور شمال میں فلینڈرز کا علاقہ۔

جنوبی یورپ میں، اٹلی کے ساحلی شہروں بالخصوص وینس (Venice)، جینوا (Genoa) اور فلورنس (Florence) نے بحیرہ روم کی تجارت پر اپنی مکمل اجارہ داری قائم کر لی۔ صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ان اطالوی تاجروں کا رابطہ مشرقِ وسطیٰ، عرب دنیا اور بازنطینی سلطنت سے قائم ہو چکا تھا۔ وہ مشرق سے آنے والا ریشم، قیمتی مسالے، عطر، رنگ اور دیگر پرتعیش اشیا خریدتے اور انہیں پورے مغربی یورپ میں بھاری منافع پر فروخت کرتے تھے۔ ان کی بحری طاقت اور تجارتی مہارت نے ان شہروں کو بے پناہ دولت مند اور خود مختار ریاستوں میں تبدیل کر دیا۔ دوسری جانب، شمالی یورپ میں موجودہ بیلجیئم اور شمالی فرانس کا علاقہ، جسے فلینڈرز (Flanders) کہا جاتا تھا، اونی کپڑے کی صنعت اور تجارت کا سب سے بڑا عالمی مرکز بن کر ابھرا۔ انگلینڈ کی بہترین معیاری اون فلینڈرز کی منڈیوں میں آتی تھی، جہاں ہنرمند

جولاہے اسے اعلیٰ قسم کے کپڑے میں تبدیل کرتے تھے جو پورے یورپ میں برآمد کیا جاتا تھا۔اس طرح شمالی یورپ کا تجارتی نیٹ ورک بحیرہ بالٹک اور بحیرہ شمالی کے گرد قائم ہو گیا۔

شمالی یورپ (فلینڈرز کی اون) اور جنوبی یورپ (اٹلی کے مسالے اور ریشم) کے ان دو بڑے تجارتی مراکز کو آپس میں منسلک کرنے کے لیے فرانس کے علاقے شیمپین (Champagne) کے نوابوں نے ایک زبردست معاشی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہاں سالانہ بین الاقوامی تجارتی میلوں کا انعقاد شروع کیا۔ یہ 'شیمپین کے میلے' پورے یورپ کے تاجروں کے لیے ملاقات کا سب سے بڑا مرکز بن گئے، جہاں دور دراز سے آئے ہوئے تاجر ہفتوں تک اپنا مال خریدتے، بیچتے اور تبادلہ کرتے تھے۔ان وسیع پیمانے کی تجارتی سرگرمیوں نے صدیوں سے رائج 'بارٹر سسٹم' (اشیا کے بدلے اشیا کا تبادلہ) کو مکمل طور پر ناکافی اور غیر عملی ثابت کر دیا۔ تجارتی حجم کو سنبھالنے کے لیے معیشت میں دوبارہ دھاتی سکوں، خاص طور پر سونے اور چاندی کے سکوں کا استعمال عام ہو گیا، جس سے یورپ ایک بار پھر 'زرعی معیشت' سے 'نقد معیشت' (Money Economy) کی طرف لوٹ آیا۔ پیسوں کے اس وسیع لین دین، مختلف ملکی کرنسیوں کے تبادلے اور دور دراز کے خطرناک سفر میں بھاری رقوم ساتھ لے جانے کے خطرات سے بچنے کے لیے اٹلی کے تاجروں نے 'بینکاری' (Banking) کے جدید خدوخال وضع کیے۔انہوں نے 'کریڈٹ' (Credit)، 'ہنڈی' (Bills of Exchange)، اور ڈبل انٹری بک کیپنگ جیسے تجارتی اور مالیاتی نظام متعارف کرائے، جنہوں نے تجارتی سرمائے کی نقل و حرکت کو انتہائی محفوظ اور تیز تر بنا دیا۔

جوں جوں شہروں کی آبادی، تجارتی حجم اور دولت میں بے پناہ اضافہ ہوا، وہاں کے تاجروں، دستکاروں اور ہنرمندوں کا ایک نیا اور طاقتور طبقہ ابھر کر سامنے آیا جسے 'بورژوازی' (Bourgeoisie) یا 'برگرز' (Burghers) کہا جاتا تھا۔ یہ درمیانہ طبقہ پرانے جاگیردارانہ نظام کے سخت قوانین سے نالاں تھا، کیونکہ لارڈز کی جانب سے لگائے گئے بے جا ٹیکس، راہداری کے محاصل اور جاگیردارانہ عدالتیں ان کی آزاد تجارت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ لہٰذا، ان شہروں کے تاجروں نے متحد ہو کر مقامی جاگیرداروں یا بادشاہوں کو بھاری رقوم کے عوض اپنے لیے 'چارٹر آف لبرٹی' (آزادی کے پروانے) خریدنا شروع کر دیے۔ان قانونی پروانوں کے تحت شہروں کو اپنے میئر خود منتخب کرنے، اپنی شہری عدالتیں قائم کرنے، اپنے ٹیکس خود جمع کرنے اور جاگیردار کی مداخلت کے بغیر آزادانہ تجارت کرنے کا حق مل گیا۔اس طرح یہ تجارتی شہر آہستہ آہستہ خود مختار اور آزاد انتظامی اکائیاں بن گئے، جس نے پرانے جاگیردارانہ نظام کے معاشی اور سیاسی تسلط پر ایک کاری اور فیصلہ کن ضرب لگائی۔

4.5 گلڈ کا نظام اور دستکاری (Guild System and Crafts)

شہروں اور قصبوں کے اس نئے اور بے مثال عروج کے ساتھ ہی، شہری معیشت، روزگار اور پیداواری معیار کو منظم کرنے کے لیے گلڈز (Guilds) یعنی پیشہ ورانہ انجمنوں کا ایک انتہائی مضبوط اور منظم نظام ابھر کر سامنے آیا۔ گلڈ دراصل ایک ہی پیشے، صنعت یا تجارت سے وابستہ افراد کی ایک طاقتور اور خود مختار تنظیم ہوتی تھی۔ عہد وسطیٰ کا شہری ذہن انفرادیت پسندی کے بجائے اجتماعیت پر یقین رکھتا تھا، اس

لیے ان انجمنوں کا بنیادی مقصد آزاد منڈی کے مسابقت پر مبنی معاشی ماڈل کی حوصلہ شکنی کرنا، اپنے اراکین کے معاشی مفادات کا تحفظ کرنا، مارکیٹ میں مکمل اجارہ داری (Monopoly) قائم رکھنا اور پیداواری معیار کو یقینی بنانا تھا۔ یہ گلڈز بنیادی طور پر دو بڑی اقسام میں منقسم تھیں: 'مرچنٹ گلڈز' (تاجروں کی انجمنیں) اور 'کرافٹ گلڈز' (دستکاروں کی انجمنیں)۔ مرچنٹ گلڈز شہر کے بڑے اور مالدار تاجروں پر مشتمل ہوتی تھیں جو شہر کی مجموعی تجارت، درآمدات اور برآمدات کو کنٹرول کرتی تھیں۔ ان کا اثر ورسوخ اتنا زیادہ تھا کہ بسا اوقات شہر کی مقامی حکومت اور مرچنٹ گلڈ کے عہدیداران ایک ہی لوگ ہوتے تھے۔

دوسری جانب، 'کرافٹ گلڈز' کا دائرہ کار مخصوص اشیا بنانے والوں تک محدود تھا۔ ہر شہر میں ہر پیشے کی اپنی ایک الگ اور طاقتور گلڈ ہوتی تھی، جیسے لوہاروں، درزیوں، موچیوں، نانبائیوں، جولاہوں، اور سنگ تراشوں کی الگ الگ انجمنیں۔ قانوناً کوئی بھی شخص متعلقہ گلڈ کا باقاعدہ رکن بنے بغیر اس شہر میں اپنی دکان، ورکشاپ یا کاروبار شروع نہیں کر سکتا تھا۔ کرافٹ گلڈز نے پیداواری عمل کو کنٹرول کرنے کے لیے انتہائی سخت اور تفصیلی اصول وضع کیے تھے۔ وہ اس بات کا فیصلہ کرتی تھیں کہ کون سی شے کس طرح تیار کی جائے گی، اس میں استعمال ہونے والے خام مال کا معیار کیا ہوگا، اور اس کی فروخت کی قیمت کیا ہوگی۔ مزید برآں، وہ کام کے اوقات کار طے کرتی تھیں تاکہ کوئی دستکار رات کے اندھیرے میں یا اضافی وقت میں کام کر کے دوسرے دستکاروں سے زیادہ مال نہ بنا لے۔ مقصد یہ تھا کہ تمام اراکین کو روزگار کے مساوی مواقع ملیں اور کوئی بھی رکن غیر معیاری مال تیار کر کے انجمن کی ساکھ کو نقصان نہ پہنچائے۔

ایک عام فرد کے لیے گلڈ کا مکمل رکن بننے کا عمل انتہائی کٹھن اور طویل ہوتا تھا، جس کا تنظیمی ڈھانچہ عموماً تین سخت درجات پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے مرحلے میں ایک نوجوان لڑکے کو، جس کی عمر دس سے بارہ سال کے درمیان ہوتی تھی، ایک 'اپرنٹس' (Apprentice) یعنی شاگرد کے طور پر کسی استاد کے سپرد کیا جاتا تھا۔ شاگرد کے والدین اور استاد کے درمیان ایک قانونی معاہدہ ہوتا تھا، جس کے تحت استاد شاگرد کو رہائش، خوراک اور ہنر سکھانے کا پابند ہوتا تھا، جب کہ شاگرد پانچ سے سات سال تک استاد کے پاس بغیر کسی اجرت کے مفت کام سیکھتا تھا۔ کام سیکھنے کی یہ مدت کامیابی سے پوری کرنے کے بعد، نوجوان دوسرا درجہ حاصل کرتا اور 'جرنی مین' (Journeyman) یعنی دہاڑی مزدور بن جاتا تھا۔ اب وہ اپنا ہنر جانتا تھا اور مختلف دکانوں پر روزانہ اجرت پر کام کر کے اپنے لیے پیسے کما سکتا تھا۔ تاہم، اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے اور تنظیم کا مکمل رکن یعنی 'ماسٹر' (Master) یعنی استاد کا درجہ حاصل کرنے کے لیے اسے ایک کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ اسے گلڈ کے ماہرین کے سامنے اپنے ہنر کا ایک اعلیٰ ترین اور بے عیب نمونہ پیش کرنا پڑتا تھا جسے 'ماسٹر پیس' (Masterpiece) کہا جاتا تھا۔ اگر گلڈ کے پرانے اساتذہ اس نمونے کے معیار کو منظور کر لیتے، تو وہ شخص بھاری فیس ادا کر کے ماسٹر بن جاتا اور اسے اپنا کاروبار چلانے اور نئے شاگرد رکھنے کی اجازت مل جاتی۔

اپنے سخت معاشی کنٹرول کے علاوہ، گلڈز عہد وسطیٰ کے شہروں میں ایک سماجی فلاحی اور مذہبی ادارے کا کردار بھی ادا کرتی تھیں۔ ہر گلڈ کا اپنا ایک سرپرست ولی (Patron Saint) ہوتا تھا جس کے نام پر وہ مذہبی تہواروں میں اپنے جھنڈوں کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔

یہ انجمنیں اپنے اراکین سے باقاعدہ چندہ جمع کرتی تھیں جس سے ایک مشترکہ فنڈ قائم کیا جاتا تھا۔ اس فنڈ سے کسی رکن کی بیماری کی صورت میں مالی مدد کی جاتی، کام کے دوران مرنے والے اراکین کی تدفین کے اخراجات اٹھائے جاتے، اور ان کے پیچھے رہ جانے والی بیواؤں اور یتیم بچوں کی کفالت کی جاتی تھی۔ اس طرح گلڈ کا نظام محض ایک تجارتی معاہدہ نہیں تھا، بلکہ یہ عہد وسطیٰ کے انسان کی پوری سماجی، معاشی اور روحانی زندگی کا احاطہ کرتا تھا۔

4.6 چودھویں صدی کا بحران: طاعون اور کسانوں کی بغاوتیں

(Crisis of the 14th Century: Plague and Peasant Revolts)

تیرہویں صدی کے اواخر تک یورپ نے آبادی، زراعت اور تجارت کے میدانوں میں شاندار اور مسلسل ترقی کی، لیکن چودھویں صدی کا آغاز براعظم کے لیے اپنے ساتھ تباہ کن بحرانوں، ماحولیاتی آفات اور وبائی امراض کی ایک ایسی سیریز لے کر آیا جس نے عہد وسطیٰ کے معاشرے کی بنیادیں ہلا دیں اور اس کی آبادیاتی ساخت کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اس بحران کا آغاز موسمیاتی تبدیلیوں سے ہوا جسے ماہرینِ ماحولیات 'چھوٹا برفانی دور' (Little Ice Age) کہتے ہیں۔ صدی کے اوائل میں ہی یورپ کا سازگار موسم اچانک تبدیل ہو گیا۔ بے تحاشا بارشوں، شدید طوفانوں اور طویل سردیوں نے پورے براعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرد موسم کی وجہ سے فصلوں کے پکنے کا دورانیہ مختصر ہو گیا اور مسلسل بارشوں نے کھیتوں کو دلدلوں میں بدل دیا۔ 1315ء سے 1317ء تک یورپ کی فصلیں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں، جس نے ایک ہولناک اور بے مثال قحط کو جنم دیا جسے 'قحطِ عظیم' (Great Famine) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یورپ کی آبادی پہلے ہی زرعی پیداوار کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، اس لیے خوراک کی معمولی سی قلت نے بھی تباہی مچا دی۔ اناج کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، جانور چارے کی کمی سے مرنے لگے، اور لاکھوں انسان بھوک اور شدید غذائی قلت کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے گئے۔

ابھی یورپ اس قحط اور غذائی قلت کے اثرات سے بمشکل سنبھل ہی رہا تھا کہ 1347ء میں اس پر ایک اور ہولناک آفت 'طاعونِ عظیم' (Black Death) کی صورت میں نازل ہوئی، جو انسانی تاریخ کی سب سے مہلک وبا ثابت ہوئی۔ یہ ایک انتہائی متعدی اور قاتل بیماری تھی جس کا سبب 'یرسینیا پیسٹس' (Yersinia pestis) نامی بیکٹیریا تھا۔ یہ بیکٹیریا بحیرہ اسود کے راستے کریمیا کی بندرگاہوں سے اطالوی تجارتی جہازوں پر آنے والے کالے چوہوں پر موجود پسوؤں کے ذریعے اٹلی میں داخل ہوا، اور پھر تجارتی راستوں کے ذریعے پورے یورپ میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ اس بیماری میں مریض کو تیز بخار ہوتا، جسم پر گلٹیاں (Buboes) نکل آتیں، اور چند ہی دنوں میں تکلیف دہ موت واقع ہو جاتی۔ عہد وسطیٰ کی طب اس وبا کا مقابلہ کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہی۔ حفظانِ صحت کے ناقص اصولوں اور گنجان آباد شہروں کے باعث، محض چار سے پانچ سالوں (1347-1351) کے مختصر عرصے کے اندر اس وبا نے پورے یورپ کی آبادی کے ایک تہائی سے لے کر نصف حصے تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ڈھائی سے تین کروڑ لوگ اس وبا کا شکار ہوئے، جس نے پورے معاشرے میں موت کا خوف اور مایوسی پھیلا دی۔

اس بے مثال آبادیاتی سانحے نے یورپ کی معیشت کا پورا توازن پلٹ کر رکھ دیا۔ اچانک آبادی میں ہونے والی اس زبردست کمی کے باعث، پورے براعظم میں مزدوروں اور کسانوں کی شدید ترین قلت پیدا ہو گئی۔ وہ کسان اور سرفز جنہیں صدیوں سے کیڑے مکوڑوں کی طرح سمجھا جاتا تھا، اچانک انتہائی قیمتی ہو گئے۔ مزدوروں کی طلب میں اضافے کے باعث انہوں نے جاگیرداروں سے زیادہ اجرتوں اور بہتر شرائط کا مطالبہ شروع کر دیا۔ دوسری جانب، آبادی کم ہونے سے خوراک کی طلب میں کمی آئی، جس کے نتیجے میں زرعی اجناس کی قیمتیں گر گئیں اور خالی پڑی زمینوں کے لگان میں زبردست کمی واقع ہوئی۔ ان متضاد حالات نے امراء اور جاگیرداروں کی آمدنی کو شدید نقصان پہنچایا۔ اپنے منافع کو بچانے کے لیے، لارڈز اور بادشاہوں نے قانون سازی کا سہارا لیا۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں 1351ء میں 'اسٹیٹیوٹ آف لیبررز' (Statute of Laborers) نامی قانون پاس کیا گیا، جس کے تحت مزدوروں کی اجرتوں کو وبا سے پہلے والی سطح پر زبردستی منجمد کر دیا گیا، اور سرفز کے لیے اپنے لارڈ کا مینور چھوڑنا قانوناً جرم قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان پر نئے اور بھاری ٹیکس (جیسے Poll Tax) نافذ کر دیے گئے۔

امراء کی جانب سے معاشی حقائق کو زبردستی دبانے اور کسانوں کے استحصال کی ان کوششوں نے طبقاتی کشمکش کو انتہا پر پہنچا دیا، جس کے نتیجے میں پورے یورپ میں کسانوں کی شدید اور خونی بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ ان میں سب سے نمایاں 1358ء میں فرانس کی 'جیکری بغاوت' (Jacquerie) اور 1381ء میں انگلینڈ کی 'کسانوں کی بغاوت' (Peasants' Revolt)، جس کی قیادت واٹ ٹائلر (Wat Tyler) نے کی، شامل تھیں۔ ان بغاوتوں میں کسانوں نے جاگیرداروں کے قلعے جلا دیے، ٹیکس کے ریکارڈ تباہ کر دیے، اور اپنے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ فوجی لحاظ سے کمزور کسانوں کی ان بغاوتوں کو امراء نے انتہائی بے دردی اور ظلم کے ساتھ کچل دیا، لیکن وہ نئے معاشی حقائق کو تبدیل نہ کر سکے۔ مزدوروں کی مسلسل کمی کے باعث جاگیرداروں کے لیے پرانا مینوریل نظام چلانا ناممکن ہو گیا۔ کسانوں کو خوش رکھنے کے لیے لارڈز مجبور ہو گئے کہ وہ روایتی بیگار (Corvée) کی جگہ نقد لگان وصول کریں، اور انہیں اپنی مرضی سے زمین چھوڑنے یا آباد کرنے کی اجازت دیں۔ اس طرح چودھویں صدی کے اس ہولناک بحران نے رفتہ رفتہ 'سرفڈم' (غلامی نما مزارعی) کا خاتمہ کر دیا، جو بالآخر جاگیردارانہ نظام کے زوال اور جدید دور کے آغاز کا سب سے بڑا سبب بنا۔

4.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد، گیارہویں سے چودھویں صدی کے درمیانی عرصے کی یورپی تاریخ، سماج اور معیشت کے حوالے سے کئی اہم اور دوررس نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلا اور بنیادی نتیجہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کا معاشرہ کوئی جامد یا رکا ہوا معاشرہ نہیں تھا، بلکہ یہ مسلسل ارتقا اور تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ رومی سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو جاگیردارانہ نظام (Feudalism) نے پُر کیا، جس نے مقامی سطح پر تحفظ تو فراہم کیا لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسا سخت گیر طبقاتی ڈھانچہ وجود میں آیا جس نے آبادی کی اکثریت یعنی کسانوں (سرفز) کو زمین کے ساتھ باندھ کر غلامی جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ اس نظام کی معاشی بنیاد

'مینوریل سسٹم' پر رکھی گئی تھی جو مکمل طور پر خود کفیل اور بیرونی دنیا کی تجارت سے کٹا ہوا تھا۔

تاہم، اس اکائی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انسانی ذہانت اور ضرورت نے کس طرح نئی راہیں تلاش کیں۔ گیارہویں صدی میں شروع ہونے والے زرعی انقلاب نے، جس میں بھاری لوہے کے ہل، گھوڑے کے کالر اور بالخصوص 'تین کھیتوں کے نظام' جیسی شاندار تکنیکی اور سائنسی تبدیلیاں شامل تھیں، یورپ کی معاشی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ ان تبدیلیوں کی بدولت زرعی پیداوار میں ہونے والے بے پناہ اضافے نے نہ صرف خوراک کے معیار کو بہتر بنایا اور آبادی میں زبردست اضافہ کیا، بلکہ فالتو پیداوار نے صدیوں سے مردہ پڑی تجارتی سرگرمیوں کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس 'تجارتی انقلاب' کے نتیجے میں نئے شہر آباد ہوئے، بین الاقوامی تجارتی میلے منعقد ہونے لگے، اور کرنسی و بینکاری کے جدید نظام نے جنم لیا۔ شہروں کے اس عروج نے تاجروں اور دستکاروں پر مشتمل ایک نیا اور طاقتور درمیانہ طبقہ (بورژوازی) پیدا کیا، جس نے 'گلڈز' جیسی مضبوط پیشہ ورانہ انجمنیں قائم کر کے جاگیرداروں کے تسلط کو چیلنج کیا اور اپنے لیے آزادی کے پروانے (Charters of Liberty) حاصل کیے۔

آخر میں، یہ اکائی ہمیں بتاتی ہے کہ تاریخی ترقی کا سفر ہمیشہ خطِ مستقیم میں نہیں ہوتا۔ چودھویں صدی کا آغاز ایک انتہائی ہولناک المیے کے ساتھ ہوا جس نے یورپ کو بنیادوں تک ہلا دیا۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کے باعث آنے والے 'قحطِ عظیم' اور اس کے فوراً بعد 1347ء میں پھیلنے والی 'طاعونِ عظیم' (Black Death) نے براعظم کی ایک تہائی سے زائد آبادی کو لقمہ اجل بنا دیا۔ اس بے مثال آبادیاتی سانحے کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے، لیکن حیرت انگیز طور پر اسی بحران نے پرانے نظام کی کمر توڑ دی۔ مزدوروں کی شدید قلت نے سرفز کی اہمیت بڑھا دی، اور جب امراء نے قانون کے زور پر ان کا استحصال جاری رکھنے کی کوشش کی تو فرانس اور انگلینڈ میں کسانوں کی تاریخی بغاوتوں نے جنم لیا۔ اگرچہ یہ بغاوتیں کچل دی گئیں، لیکن انہوں نے جاگیردارانہ استحصال اور مینوریل نظام کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، جس کے نتیجے میں کسان رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگے، نقد لگان کا رواج عام ہوا، اور یورپ ایک نئے روشن دور یعنی نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کی دہلیز پر پہنچ گیا۔

4.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

جاگیردارانہ نظام (Feudalism): یہ عہد وسطیٰ کا وہ بنیادی سیاسی، عسکری اور سماجی نظام تھا جس کے تحت طاقتور بادشاہ اپنی مملکت کی وسیع زمینیں اپنے ماتحت امراء (Lords) کو عسکری خدمت اور وفاداری کے حلف کے بدلے عطا کرتا تھا۔ زمین کا یہ عطیہ 'فیف' (Fief) کہلاتا تھا۔ اس نظام میں طاقت مرکز میں نہیں بلکہ مقامی نوابوں اور جاگیرداروں کے پاس بٹی ہوئی تھی جو اپنی زمینوں پر مکمل انتظامی اور عدالتی کنٹرول رکھتے تھے۔

مینوریل نظام (Manorialism): یہ جاگیرداری کا معاشی پہلو تھا۔ ہر لارڈ یا جاگیردار کی اپنی ایک اسٹیٹ ہوتی تھی جسے مینور کہا جاتا تھا۔ یہ ایک مکمل طور پر خود کفیل دیہاتی علاقہ ہوتا تھا جس میں قلعہ، چرچ، کسانوں کے گھر، اور کھیت شامل تھے۔ مینور کے اندر پیدا ہونے والی اشیا

وہیں استعمال ہوتی تھیں اور اس کا مقصد بیرونی تجارت کے بجائے مقامی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔

سرف (Serf): مینوریل نظام کے تحت سرف وہ کسان تھا جو قانونی طور پر لارڈ کی زمین کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اسے خرید و فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن وہ آزاد بھی نہیں تھا۔ وہ لارڈ کی اجازت کے بغیر مینور نہیں چھوڑ سکتا تھا، اسے لارڈ کی ذاتی زمین پر مفت بیگار (Corvée) کرنی پڑتی تھی، اور اپنی پیداوار کا بڑا حصہ ٹیکس کے طور پر دینا پڑتا تھا۔

تین کھیتوں کا نظام (Three-Field System): گیارہویں صدی کی یہ ایک انتہائی انقلابی زرعی تکنیک تھی جس نے پیداوار میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس کے تحت کسان اپنی زمین کو دو کے بجائے تین مساوی حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک میں سردیوں کی فصل (گندم)، دوسرے میں بہار کی فصل (پھلیاں، مٹر)، اور تیسرا حصہ زرخیزی بحال کرنے کے لیے خالی چھوڑا جاتا تھا۔ پھلیوں کی کاشت نے مٹی میں نائٹروجن شامل کی اور لوگوں کی خوراک میں پروٹین کا اضافہ کیا۔

طاعونِ عظیم (Black Death / Bubonic Plague): یہ انسانی تاریخ کی سب سے مہلک اور خوفناک متعدی وبا تھی جو 1347ء میں بحیرہ اسود کے راستے تجارتی جہازوں پر آنے والے چوہوں کے پسوؤں کے ذریعے یورپ میں داخل ہوئی۔ محض چند سالوں میں اس وبا نے یورپ کی ایک تہائی سے نصف آبادی کو ہلاک کر دیا، جس سے مزدوروں کی زبردست قلت پیدا ہوئی اور معاشی و سماجی ڈھانچہ تباہ ہو گیا۔

گلڈ (Guild): عہدِ وسطیٰ کے ابھرتے ہوئے شہروں میں تاجروں یا دستکاروں کی پیشہ ورانہ اور طاقتور تنظیموں کو گلڈ کہا جاتا تھا۔ ان کا مقصد آزاد تجارت کی مسابقت کو روکنا، پیداواری معیار کو برقرار رکھنا، اشیا کی قیمتیں اور کام کے اوقات مقرر کرنا، اور اپنے اراکین کو معاشی اور سماجی تحفظ فراہم کرنا تھا۔ شاگرد، دیہاڑی دار اور ماسٹر اس کے تین درجات تھے۔

بورژوازی (Bourgeoisie / Burghers): گیارہویں صدی کے بعد تجارتی احیاء کے نتیجے میں شہروں میں ابھرنے والا نیا درمیانہ طبقہ جو تاجروں، بینکاروں اور ماہر دستکاروں پر مشتمل تھا۔ اس طبقے کی طاقت کا دارومدار زمین کے بجائے سرمائے اور تجارت پر تھا۔ انہوں نے جاگیردارانہ نظام کو چیلنج کیا اور اپنے شہروں کے لیے خود مختاری اور آزادی کے چارٹر حاصل کیے۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جاگیردارانہ نظام میں زمین حاصل کرنے والے شخص (جسے لارڈ کے ماتحت سمجھا جاتا تھا) کو کیا کہا جاتا تھا؟

(الف) ماسٹر (ب) واسل (ج) سرف (د) برگر

2. زرعی غلام کے لازمی طور پر ہفتے میں چند دن لارڈ کی ذاتی زمین پر بغیر معاوضے کام یا بیگار کو قانونی اصطلاح میں کیا کہتے تھے؟

(الف) ٹائتھ (ب) چارٹر (ج) کوروی (د) فیف

3. کس زرعی ایجاد نے گھوڑے کو ہل کھینچنے کے قابل بنایا جس سے اس کی سانس کی نالی پر دباؤ نہیں پڑتا تھا؟

(الف)لوہے کا نعل (ب)بھاری ہل (ج)گدی دار گردن کا پٹہ (د)پہیے والی گاڑی

4. بارہویں اور تیرہویں صدی میں شمالی یورپ کا کون سا علاقہ اونی کپڑے کی صنعت اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز بن کر ابھرا؟

(الف)فلورنس (ب)فلینڈرز (ج)شیمپین (د)جینوا

5. کرافٹ گلڈ (دستکاروں کی انجمن) کا مکمل رکن اور استاد بننے کے لیے ایک جرمنی مین کو کیا پیش کرنا ضروری تھا؟

(الف)زمین کا ٹکڑا (ب)ماسٹر پیس (ج)آزادی کا چارٹر (د)سونے کے سکے

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 'فیف'(Fief)اور 'مینور'(Manor)کے درمیان بنیادی فرق واضح کریں۔
2. 'تین کھیتوں کے نظام' نے کس طرح یورپی عوام کی خوراک اور صحت کے معیار کو بہتر بنایا؟ مختصراً بیان کریں۔
3. شیمپین(Champagne)کے تجارتی میلوں کی عہد وسطیٰ کی معیشت میں کیا اہمیت تھی؟

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گیارہویں سے تیرہویں صدی کے درمیان رونما ہونے والے 'زرعی انقلاب' کی تفصیلات بیان کیجیے۔
2. چودھویں صدی کو بحرانوں کی صدی کیوں کہا جاتا ہے؟ قحطِ عظیم، طاعون اور کسانوں کی بغاوتوں پر ایک جامع مضمون تحریر کیجیے۔

جوابات

1۔(ب)واسل 2۔(ج)کوروی 3۔(ج)گدی دار گردن کا پٹہ 4۔(ب)فلینڈرز

5۔(ب)ماسٹر پیس

اکائی 5۔مذہبی لام بندی: صلیبی جنگیں اور یوروپی سماج پر ان کے اثرات

(Religious Mobilisation : Crusades and Their Impact on European Society)

اکائی کے اجزاء

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 تاریخی پس منظر

5.3 صلیبی جنگوں کے اسباب

5.3.1 سیاسی اسباب

5.3.2 مذہبی اسباب

5.3.3 دیگر اسباب

5.4 پہلی صلیبی جنگ

5.5 دوسری صلیبی جنگ

5.6 تیسری صلیبی جنگ

5.7 چوتھی صلیبی جنگ

5.8 دیگر صلیبی جنگیں

5.8.1 بچوں کی صلیبی جنگ

5.8.2 دیگر صلیبی مہمات

5.9 صلیبی جنگوں کی اہمیت اور ان کے اثرات

5.10 اکتسابی نتائج

5.11 کلیدی الفاظ

5.12 نمونہ امتحانی سوالات

5.0 تمہید (Introduction)

گیارہویں صدی کی آخری دہائی سے لے کر تیرہویں صدی کے اخیر حصہ تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو جنگیں لڑی گئیں، انہیں تاریخ میں صلیبی جنگیں (کروسیڈ) کہا جاتا ہے۔ یروشلم (فلسطین) کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے یوروپ کے عیسائی حکمرانوں اور کلیسا کے سربراہوں کے ساتھ اُن کی عوام نے متحدہ طور پر جن مہمات کو انجام دیا، انہیں بعد میں صلیبی جنگ کا نام دیا گیا، کیونکہ وہ مذہب کے نام پر لڑی گئیں اور صلیب کی حرمت ان کا مقصد تھا۔ اس کے علاوہ مشرق کی لاطینی حکومت کا تحفظ بھی زیر نظر رہا۔ کچھ مورخین ان جنگوں کو تاریخ کے مختلف ادوار میں مشرق و مغرب کے درمیان ہونے والے تصادم کی ہی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ دنیا کے دو بڑے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان یہ جدوجہد تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے اور اس کے عالمگیر اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ان صلیبی جنگوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے اختلاط کے عمل کو انجام دیا اور ساتھ ہی مشرق و مغرب کی ثقافتوں کو بھی قریب آنے کا موقع فراہم کیا۔ ان جنگوں کا بنیادی سبب سیاسی و مذہبی تھا، لیکن انسانی زندگی کے تمام شعبے اس سے متاثر ہوئے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- ایشیاء اور یوروپ کی سیاسی و مذہبی صورتحال کو سمجھ سکیں گے۔
- مسلمانوں کے عروج اور عیسائیوں کے ساتھ ان کے تصادم سے واقف ہو جائیں گے۔
- عہدِ وسطیٰ کے مسلم اور عیسائی حکمرانوں کے سیاسی عزائم اور ان کی عسکری قوت سے روشناس ہو جائیں گے۔
- صلیبی جنگوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی نتائج کا تجزیہ کر سکیں گے۔

5.2 تاریخی پس منظر

یروشلم (فلسطین) کا علاقہ دنیا کے تین بڑے مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے لیے یکساں تقدس کا حامل ہے۔ 1000 ق م میں حضرت داؤد علیہ السلام نے یروشلم کو فتح کیا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ان کے جانشین فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلا ہیکل تعمیر کرایا، جس کے بعد سے یہودیوں کا یہ مقدس مرکز بن گیا، لیکن 586 ق م میں بابل کے حکمراں بخت نصر نے اس پر حملہ کر کے تباہ کر دیا اور ہیکل سلیمانی کو بھی نذر آتش کر دیا۔ یہی نہیں اس نے یہودیوں کو بھی جلاوطن کر دیا۔ 538 ق م میں سائرس اعظم نے بابل کو فتح کیا اور یہودیوں کو دوسرا ہیکل تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ 70ء میں رومی جنرل ٹائٹس نے دوسرے ہیکل کو بھی مسمار کر دیا اور 135ء میں یہودیوں کو دوبارہ یروشلم سے نکال دیا گیا۔ 313ء کے بعد شہنشاہ کانسٹنٹائن کے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دینے کے بعد اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں 638ء میں مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا۔ بعد کے ادوار میں یہاں قبۃ الصخرا (Dome of the Rock) اور 'مسجد اقصیٰ' کی تعمیر ہوئی اور اسلام میں

مکہ و مدینہ کے بعد تیسرے مقدس شہر کی حیثیت حاصل ہوگئی، جس کے بعد سے یہ مسلسل مختلف اسلامی حکومتوں کا حصہ رہا۔ اموی، عباسی اور فاطمی حکمرانوں کے بعد 11 ویں صدی میں سلجوق ترکوں کے ماتحت آیا، جس کے بعد مختلف اسباب کی بنیاد پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس پر تسلط حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہی دور صلیبی جنگوں کا نقطہ آغاز ہے۔

یروشلم (فلسطین) کو انبیاء کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ اسی تقدس کی بنا پر اس علاقہ کے حصول اور اس پر تسلط کے لیے جتنے یہودی کوشاں تھے، اتنے ہی مسلمان اور عیسائی اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کوئی بھی اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی مضبوطی اور عسکری قوت کی بنیاد پر یروشلم پر حکمرانی کا فیصلہ ہوتا رہا۔ ساتویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی تک کا زمانہ مسلمانوں کے عروج کا دور تھا۔ سیاسی اور فوجی طاقت کے لحاظ سے دوسروں کے لیے ان کے مقابل آنا اور ٹھہرنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ یروشلم اس پوری مدت اسلامی حکومت کا حصہ بنا رہا۔ لیکن گیارہویں صدی میں یوروپ میں ایسی سیاسی صورتحال پیدا ہو چکی تھی جو مسلمانوں سے ٹکرانے کے لیے تیار تھی۔ مذہبی جمعیت اور سیاسی ضرورت نے اس جذبہ کو مہمیز کیا۔ نتیجتاً مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک لمبے تصادم کا آغاز ہوا اور مختلف جنگیں لڑی گئیں، جو تاریخ کے صفحات میں ''صلیبی جنگیں'' (کروسیڈ) کے نام سے محفوظ ہیں۔

5.3 صلیبی جنگوں کے اسباب

گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک لڑی جانے والی صلیبی جنگیں، جنہوں نے ایک مدت تک یوروپ کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو برسرپیکار رکھا، حالانکہ ان کا بنیادی سبب مذہبی تناظر میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کے پس پشت دیگر مختلف النوع قسم کی وجوہات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور سے سیاسی و سماجی صورتحال، جس سے اس وقت یوروپ دوچار تھا، کسی طور بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ اس تصادم میں کارفرما عوامل کو مندرجہ ذیل نکات کے تحت سمجھ سکتے ہیں۔

5.3.1 سیاسی اسباب

1025ء میں بازنطینی شہنشاہ باسل دوم (Basil II) کی موت سلطنت کے لیے ایسا سانحہ ثابت ہوئی، جس سے وہ کبھی باہر نہیں آسکی۔ اگلی نصف صدی تک کمزور انتظامیہ، سیاسی انتشار اور اندرونی خانہ جنگی کا دور دورہ رہا۔ نارمن قوم نے جنوبی اٹلی پر قبضہ کرلیا اور فوجی اعتبار سے سلجوق ترکوں نے انہیں بدترین شکست دی، جس کے نتیجے میں سلجوق ترک ایک طاقتور سیاسی و عسکری قوم بن کر ابھرے۔ طغرل بیگ کے جانشین نے شام وار یروشلم پر قبضہ کرلیا اور اگست 1071ء میں الپ ارسلان نے آرمینیا میں اوقع منزکرٹ کی جنگ میں بازنطینی فوج کے بیشتر حصے کو تباہ کردیا اور شہنشاہ رامونس ڈایوجینس کو قیدی بنالیا۔ اس شکست نے بازنطینی سلطنت کی کمر توڑدی۔ اس جنگ میں ترکوں کی فتح کا ایک بڑا اثر یہ پڑا کہ مغربی فلسطین جانے والے یورپی عیسائیوں کا راستہ دشوار ہوگیا۔ لیکن یہ سلطنت 11 ویں صدی کے آخر تک چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوگئی اور اس کا اثر کم ہوگیا، جس نے عیسائیوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مغربی فلسطین پر حملے کرسکیں۔

ملاذ گرد (Manzikert) کی جنگ میں بازنطینی شکست اور شہنشاہ رومانوس چہارم کی گرفتاری کے بعد قسطنطنیہ کی ریاست کو اپنی بقا کے لیے مغربی یوروپ کی طرف دیکھنا پڑا۔ مسلسل بڑھتی ہوئی مسلم طاقت کو شکست دینے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ مغربی یوروپ کی ریاستیں اُن کی مدد کریں۔ مسلمانوں کے خلاف آغاز میں اس نے جاگیر داروں اور راجاؤں کو اپنے ساتھ ملا کر مہم کا آغاز کیا تھا جو ناکامیاب رہا۔ چنانچہ بازنطینی حکمراں الیکسیوس اول (Alexious I)(1081-1118) نے 1095ء میں پوپ اربن دوم سے مدد طلب کی۔ اس سے قبل مغربی یوروپ میں 1034ء کے بعد سے اسپینی مذہبی جنگوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن بازنطینی ریاست کی مدد کے لیے مشرق کی طرف جنگوں کا رخ مڑ گیا۔ پوپ اربن دوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں راہبانہ صفات کے ساتھ ساتھ ایک ماہر سیاست داں کی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ اسے محسوس ہو گیا کہ ریاست پر کلیسا کی فوقت قائم رکھنے کے لیے یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اسے کے علاوہ اس کا خیال تھا کہ اگر مشرق کے اس مشن میں وہ کامیاب رہا تو مغربی یوروپ میں بھی اس کا وقار بند ہو گا۔

بازنطینی حکومت پر منڈلاتے خطرات کے علاوہ اگر اس وقت کی یوروپ کی مجموعی سیاسی صورتحال پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جاگیر داری نظام عروج پر تھا۔ بادشاہ کمزور تھے اور اصل طاقت مقامی جاگیر داروں 'لارڈز اور نوابوں کے پاس تھی، جو اپنی اپنی زمینوں پر خود مختار حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مقدس رومی سلطنت انتشار کا شکار اور اندرونی طور پر بہت کمزور اور چند جرمن ریاستوں تک محدد تھی۔ زیادہ تر یوروپی ممالک میں خانہ جنگی اور تخت کے لیے جھگڑے چل رہے تھے۔ متحدہ یوروپ کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ چنانچہ مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو کر حکمرانوں کی آپسی کشمکش کو دور کرنا بھی ایک مقصد تھا۔

5.3.2 مذہبی اسباب

فلسطین کی سرزمین سے عیسائیوں کا براہ راست اور گہرا مذہبی تعلق تھا۔ حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش بیت اللحم سمیت یہ پورا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین تھا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا تھا، جس کے بعد سے یہاں عیسائیوں کی آمد محض زائرین کی حیثیت سے ہونے لگی تھی۔ یہاں تک کہ گیارہویں صدی عیسوی تک یہ تعداد بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ گئی، جو مسلمانوں کے لیے مالی اعتبار سے سود مند ہی تھی، کیونکہ یہ زائرین مقامی افراد اور حکومتی عملے کو روپیہ پیسہ دیتے تھے۔ اس صورتحال میں ایک اہم تبدیلی اس وقت وقوع پذیر ہوئی جب سلجوق طاقت کا عروج ہوا، جس کے بعد سے ایسا لگنے گلا کہ عیسائیوں کے لیے ان علاقوں میں آنا اور اپنے مذہبی مقامات کی زیارت کرنا مشکل ہو گیا۔ ان کے لیے اور غیر سماجی عناصر کے ہاتھوں ہراساں کیے جانے کے معاملات میں اضافہ ہوا، جس سے عیسائی طبقہ میں یہ عمومی احساس پیدا ہوا کہ ان کے لیے اپنے مقدس مقامات کی زیارت کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ مسلمان اس میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ان پر مسلمانوں کے قبضے سے وہ پہلے سے ہی ناراض تھے، جب ان کے لیے وہاں کی زیارت میں پریشانیاں پیدا ہوئیں تو ان کے دل میں یہاں سے مسلمانوں کو بے دخل کر دینے اور دوبارہ انہیں اپنے زیر نگیں لانے کا جذبہ تیزی سے پروان چڑھا، جسے مذہبی افراد' پادری و بشپ وغیرہ نے مزید قوت دی۔ اس کے علاوہ جو عیسائی ان علاقوں میں مستقل آباد تھے، ان کو بھی لگتا تھا کہ مسلمان عوام اور حکومت دونوں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہیں مختلف طریقوں سے ستایا جاتا ہے۔ ان کے مال و املاک بھی محفوظ نہیں

ہیں اور وہ ہمیشہ لٹیروں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ عیسائیوں کی کسمپرسی اور زبوں حالی کی داستان زائرین کے ساتھ یوروپ تک پہنچی۔ فلسطینی عیسائیوں پر لگنے والے مختلف ٹیکسوں اور مذہبی و سماجی آزادی کے تعلق سے یوروپ والوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ان علاقوں میں عیسائیوں کی بود و باش، سفر اور قیام بہت مشکل ہے اور جب تک یہ مسلمانوں کے قبضے سے آزاد نہیں کرائے جائیں گے عیسائیوں کے لیے مخدوش ہی رہیں گے۔ اس بات کی ضرورت سمجھی جانے لگی کہ اب عیسائیوں کا ان علاقوں سفر صرف زائرین کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایسے مذہبی جنگجو افراد کے روپ میں ہونا چاہیے جو ان مقدس مقامات کو مسلمانوں کے جبری قبضے سے آزاد کرا سکیں۔ اس کے لیے مختلف جہتوں میں کوشش شروع ہو گئیں۔ ایسے جنگجو افراد کو حکومت اور سماج میں عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا، جو جاگیر دار یا راجہ ان سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے ان کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا۔ معاشی و سماجی طور پر ان کی طاقت بڑھ گئی۔ اس طرح مذہبی عسکریت بڑھنے لگی۔ فلسطین کے علاقے میں عیسائیں کے مسائل کے علاوہ کچھ دوسرے عناصر بھی مذہبی جنگوں کے پس پشت کارفرما تھے۔ ان میں سے ایک تھا خود چرچ کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا اثر۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے امن و آشتی اور صلح پر زور دیا تھا۔ لیکن بر بر اقوام یا اُن سے منسلک جنگجو قبیلوں کے عیسائیت قبول کرنے کے ساتھ چرچ کے اندر صلح پسندی کی جگہ تصادم اور ٹکراؤ میں اضافہ ہوا۔ بر بر اقوام اپنے ساتھ اپنی جنگجو فطرت لے کر عیسائیت میں داخل ہوئیں۔ علاوہ ازیں اپنے نئے مذہب میں اپنی عقیدت کو پختگی دینے کے لیے اپنی طاقت کے استعمال کو یہ پسندیدہ سمجھتے تھے۔ نائٹ اور جاگیر دار طبقہ کے لیے بھی اپنی عسکریت کے مظاہرے کے لیے مذہب نے خاطر خواہ مواقع فراہم کیے۔ گذشتہ تین صدیوں سے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی تعلقات کی نوعیت نے بھی دونوں قوموں کے مابین تصادم کے لیے راستے ہموار کیے۔ عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی کامیابیوں نے پوپ اور کلیسا دونوں کی ساکھ پر منفی اثر ڈال۔ اس کے بر خلاف عیسائیوں کی چھوٹی سی کامیابی سے بھی چرچ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس صورتحال نے کلیسا اور پوپ دونوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے اثر اور قوت میں اضافے کے لیے مسلمانوں کے خلاف محاذ کھڑا کریں اور اس میں کامیابی کے ذریعے اپنے اقتدار کو محفوظ رکھیں۔ کلیسا نے محسوس کر لیا تھا کہ انہیں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے مسلمانوں سے لوہا لینا لازمی تھا۔ نویں اور دسویں صدی کے آغاز میں پوپ گریگوری چہارم اور لوی چہارم وغیرہ نے مسلمانوں کے خلاف جنگوں اور تصادم میں بہت فعال کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پوپ اور کلیسا نے مذہبی جنگوں کی شدت کو تیز کیا۔ کلیسا کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ان مذہبی جنگوں میں حصہ لینے والے عیسائیوں کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ اور وہ جنّت میں جائیں گے۔ اس طرح کے اعلانوں سے عیسائیوں میں مذہبی جوش بھر دیا اور وہ مذہب کے تحفظ اور اشاعت کے لیے تن من دھن سے تیار ہو گئے۔ مقامات مقدسہ پر قبضہ اور زائرین کو سہولتیں فراہم کرنے کے مقصد نے عیسائیوں کو لڑنے پر آمادہ کیا۔

5.3.3 دیگر اسباب

سیاسی و مذہبی صورتحال ہی صلیبی جنگوں کا سبب نہ تھی، بلکہ کچھ دیگر چھوٹی وجوہات بھی ہیں جن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نارمن قوم اپنی فطرت کے اعتبار سے نہ صرف لڑاکو تھی بلکہ مسلسل جنگوں میں مصروف رہنا اپنی بقا کے لیے ضروری سمجھتی تھی۔ گیارہویں صدی عیسوی میں نارمنز اپنے جنگجو سرداروں کی قیادت میں آفریقہ و دیگر مسلم علاقوں پر پے در پے حملے کر رہے تھے۔ ان کی اس

عسکریت نے دیگر عیسائی طبقوں پر بھی گہرا اثر ڈالا اور صلیبی جنگوں کے عمل میں اہم کردار ادا کیا۔

صلیبی جنگوں میں جاگیر دارانہ نظام نے بھی معاونت کی۔ فیف (Fief) کی اصطلاح اسی نظام سے متعلق ہے۔ عیسائی دنیا میں فلسطین کی زمین کو Fief سمجھا جاتا تھا اور اسی حق سے اس کے حصول اور قبضے کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس پر مسلمانوں کے تسلط کو برداشت کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسی جذبہ کے تحت شارلیمن نے اپنی سلطنت کے قیام کے فوراً بعد فلسطین کے معاملے میں اپنی دلچسپی دکھائی اور یہی وجہ تھی کہ جب عیسائی زائرین کے لیے مقدس مقامات کا سفر اور قیام مشکل ہوا تو پوپ نے فلسطین کی اس 'Fief' کے حصول کے لیے اپیل کی اور ترغیب دلائی، جس کے بعد پہلی صلیبی جنگ کی بنیاد پڑی۔

صلیبی جنگوں کے شمولیت کے کچھ دیگر اسباب بھی تھے۔ مثلاً بہت سے لوگ صرف مہم جویانہ طبیعت، مقامات کی تبدیلی اور تجسس کی وجہ سے اس طرف راغب ہوئے۔ سیاسی و معاشی مفاد اور پیشہ ورانہ اغراض بھی بہت سے لوگوں کی ان جنگوں میں شمولیت کی وجہ تھیں۔ بہت سے جاگیر دار، نائٹ اور راجہ مسلمانوں سے مشرقی علاقوں کو چھین لینے کے لیے جنگ کے میدان میں آئے۔ ان کے علاوہ بہت سے مقروض، مجرم اور قانون سے بھاگے ہوئے افراد نے بھی جنگی میدان میں پناہ لی۔

ان سب اسباب کے علاوہ اس وقت کی صورتحال بھی ان مذہبی جنگوں کے موافق تھی۔ ہنگری کے باشندوں کے عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد یوروپ کے مشرقی حصے کا زمینی راستہ کھل گیا تھا۔ اٹلی کی ریاستوں کی بحری طاقت میں اضافہ ہونے اور سسلی سے مسلمانوں کے اخراج نے اس بحری راستے کو کھول دیا تھا جو اس سے قبل مسلمانوں کے کنٹرول میں تھا۔ سلجوق سلطنت مائل بہ زوال تھی۔ عربوں اور ترکوں میں اختلافات شدید تھے، جو عیسائیوں کے حق میں تھے۔ کلیسا اور پوپ مضبوط ہو رہے تھے، جس کے نتیجے میں عوام و خواص میں مذہبی جنگوں کے لیے اُن کی ترغیبات مؤثر ثابت ہوئیں۔

5.4 پہلی صلیبی جنگ (1096-1099)

گیارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں صورتحال مسلمانوں اور عیسائیوں کے تصادم کے لیے پوری طرح سے سازگار ہو چکی تھی۔ اس کے پس پشت جو اسباب کارفرما تھے ہم اوپر ان کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ان میں بالخصوص سرزمین فلسطین کا مسئلہ نبائے مخاصمت کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے عیسائی عوام اور خواص دونوں کمربستہ ہو چکے تھے۔ 1095ء میں پوپ اربن دوم نے فرانس کے شہر کلرمونٹ (Clermont) میں عیسائیوں کو مسلمانوں کے جہاد کے لیے ابھارا۔ اس نے اپنے خطاب کے ذریعے اُنہیں یقین دلایا کہ جو لوگ مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں حصہ لیں گے اُن کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اس یقین دہائی نے عوام میں جوش بھر دیا۔ خصوصاً نائٹس جہاد کے جذبے سے سرشار ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی باقاعدہ فوج اس مقصد سے آگے بڑھتی یا حملہ آور ہوتی، عوام کی ایک بے قابو فوج ایک فرانسیسی پادری 'پیٹر دی ہرسٹ' کی قیادت میں مسلمانوں کے خلاف آگے

بڑھی۔ اسے تاریخ میں ''عوامی جہاد'' یا Public Crusade کہا جاتا ہے۔ اس عوامی فوج میں راہب، درویش، پادری، کسان، امیر، غریب، مجرم، عورتیں و بچے سبھی شامل تھے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا مقصد صرف موقع کا فائدہ اُٹھا کر لوٹ مار کرنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہر کوئی یوروپ سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ کتنے ہی سیدھے سادھے لوگ جن کی فصلیں خراب ہوئی تھیں، ظالم زمینداروں کے ستم سے بچنے کے لیے اس بھیڑ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ انہوں نے دوپہیہ گاڑیوں میں گھوڑے کی طرح بیل جوت لیے تھے۔ کانسٹینٹینوپل (قسطنطنیہ) پہنچنے پر اس عوامی فوج نے شہر میں لوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتیں انجام دینا شروع کر دیں۔ بازنطینی حکمراں الیکسیس سلجھا ہوا سیاست داں تھا۔ اس نے انہیں صلاح دی کہ جب تک باقاعدہ فوج ساتھ نہ آجائے انہیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ لیکن اپنی رعایا و املاک کو نقصان پہنچتے دیکھ کر اس نے انہیں آگے بڑھ جانے دیا۔ ترک افواج سے ان کا ٹکراؤ ہوا اور جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا ویسا ہی ہوا۔ منظم ترکوں نے نہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔ پیٹر دی ہرمٹ اپنے بہت تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ جان بچانے میں کامیاب ہو پایا۔

یوروپ میں تین لاکھ یا بعض اندازوں کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ جنگجو افراد پر مشتمل فوج مسلمانوں سے اپنے مقدس مقامات واپس لینے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ یہ یوروپ کے مختلف راجاؤں کی متحدہ فوج تھی۔ ان میں ریمنڈ چہارم (Raymond IV)، گوڈفرے (Godfrey)، بالڈوِن (Boldwin)، رابرٹ دوم (Robert II) اور بوہیمنڈ (Bohemend) وغیرہ اہم حکمراں اس کی قیادت کر رہے تھے۔ پیٹر دی ہرمٹ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ یہ فوج تین حصوں میں منقسم ہو کر تین الگ الگ راستوں سے قسطنطنیہ کی جانب روانہ ہوئی۔ اس اطلاع سے الیکسیس (Alexious I) گھبرا گیا۔ اس نے پوپ سے تھوڑے سے فوجیوں کی اپیل کی تھی۔ لیکن اسے پتہ چلا کہ تمام یوروپ، ایڈریاٹک اور خلیج جبرالٹر کے درمیان رہنے والی بربر اقوام اپنے خاندانوں سمیت بڑی تعداد میں ایشیاء کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ صورتحال خود اس کے لیے بھی خطرناک تھی۔ علاوہ ازیں اس کا پرانا دشمن جنوبی اٹلی کا حکمراں بوہیمنڈ بھی عازم سفر تھا اور اس نے اپنی فوج کو بازنطینی سلطنت کی حدود کے اندر غارتگری کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ بوہیمنڈ اور اس کے بعد دیگر قائدین افواج جب الیکسیس سے ملے تو موخرالذکر نے ان سب سے اپنے لیے وفاداری کا حلف اٹھانے کی مانگ کی۔ بوہیمنڈ کے علاوہ سب نے اسے قبول کر لیا۔ گودل سے وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ قسطنطنیہ میں اپنے معاملات طے کرنے کے بعد یہ فوج شام کے شمالی حصے میں واقع مشہور شہر انطاکیہ (Antioch) کی طرف روانہ ہوئے۔

اناطولیہ کے راستے میں ان افواج نے 'نیقیا' (Nicaea) شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جولائی 1097ء میں ڈورلیئم (Dorylaeum) کی جنگ میں ترکوں کو شکست دے کر صلیبیوں نے نیقیا شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اگلا نشانہ انطاکیہ (Antioch) کا شہر ہی تھا۔ اس پر بوہیمنڈ اپنا قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ یہاں عیسائی رہنماؤں کے درمیان اختلاف ابھر آئے۔ بالڈون، انطاکیہ پہنچنے سے قبل ہی مرکزی فوج سے علیحدہ ہو گیا اور الرہا (Edessa) کا مالک بن بیٹھا۔ (وہ یہاں طویل عرصہ تک مقیم رہا جب تک کہ 1100ء میں یروشلم کا اپنے بھائی گاڈفرے کی جگہ حکمراں نہ بن گیا)۔

آپسی اختلافات، ترکوں کی سخت مزاحمت اور راستہ کی دشواریوں کے باوجود عیسائیوں کی مرکزی فوج انطاکیہ کی طرف بڑھتی رہی۔ بار برداری کے لیے استعمال ہونے والے بے شمار گھوڑے ہلاک ہوگئے اور سامان ڈھونڈھنے کا کام بھیڑوں اور کتوں تک سے لیا گیا۔ بالآخر 1098ء میں انطاکیہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ شہر کو فتح کرنے کے لیے بوہیمنڈ نے اپنی پوری طاقت لگادی۔ جون 1098ء میں شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔ شہر کی فتح میں عیسائی فوج کی بہادری اور جوش سے زیادہ خود شہر کے باشندوں کی غداری نے کردار ادا کیا۔ کچھ عرصے بعد ترکوں کی ایک بڑی فوج نے شہر کی واپسی کے لیے حملہ کیا اور انطاکیہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اسے مار بھگانے میں عیسای کامیاب ہوگئے۔ بوہیمنڈ جس کی نیت شروع سے ہی انطاکیہ پر اپنا تسلط جمانے کی تھی وہیں جم گیا، جس کے بعد ریمنڈ اپنی فوج کے ساتھ آگے کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت یروشلم ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس پر مصر کی فاطمی حکومت کا قبضہ تھا۔ جون 1099ء میں صلیبی فوجیں یروشلم پہنچ گئیں اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے مضبوط دفاعی تیاریاں کی تھیں اور پہلے حملے کو ناکام کر دیا، لیکن عیسائیوں نے جوش و جذبے سے سرشار دوبارہ حملہ کیا اور 15 جولائی 1099ء کو یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ فاتح فوج نے شہر میں داخل ہو کر بڑے پیمانے پر لوٹ مار اور قتل و غارت گری انجام دی۔ بے شمار دولت فوجیوں کے ہاتھ لگی۔ لورین کے حاکم گاڈفرے کو یروشلم کا حکمراں منتخب کیا گیا۔ اس نے راجہ کا خطاب اختیار نہیں کیا وہ خود کو اس مقدس سرزمین کا نگہبان کہتا تھا۔ لیکن بعد 1100ء میں جب اس کا بھائی بالڈون حکمراں منتخب ہوا تو اس نے اپنے لیے راجہ کا خطاب اختیار کیا۔ یروشلم پر عیسائیوں کا قبضہ تو ہو گیا لیکن جلد ہی ایک بڑی مسلم فوج فاطمی خلیفہ کی جانب سے الفضل کی قیادت میں شہر کو واپس لینے اور اس پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائی فوج پر حملہ آور ہوئی۔ لیکن 12 اگست 1099ء کو ایسکلن کی جنگ میں گارفرے نے صرف دس ہزار صلیبیوں کی مدد سے مصر کی 20 ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج کو شکست دے دی۔ پہلی صلیبی جنگ کی یہ آخری کامیابی تھی، جس نے صلیبیوں کے مقدس مقامات کو آزاد کرانے کی قسم کی تکمیل کر دی۔ اپنے مشن میں کامیابی کے بعد بیشتر صلیبی مجاہد خشکی و تری کے راستے سے اپنے اپنے گھروں کو اوپس ہوگئے۔ اس کامیابی نے یوروپ کے مختلف حصوں میں عیسائی عوام کو جوش سے بھر دیا، جس کے نتیجے میں تین نئی افواج قسطنطنیہ ہوتے ہوئے ایشیا مائنر عبور کر کے آگے بڑھیں۔ لیکن یہ جس افراد پر مشتمل تھی وہ غیر تربیت یافتہ تھے اور ان کے پاس اسلحہ بھی ڈھنگ کا نہیں تھا۔ ساتھ ہی قیادت کرنے کے لیے باصلاحیت کمانڈر سے بھی یہ افواج محروم تھیں۔ نتیجتاً ترکوں نے ان سب کو نہ صرف شکست فاش دی بلکہ پوری طرح سے تباہ کر دیا۔ بہت کم لوگ تھے جو اپنی جانیں بچا کر یوروپ واپس لوٹ سکے۔ کئی لاکھ افراد نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھوئے۔ فاتحین نے چار صلیبی ریاستیں قائم کیں۔ بیت المقدس کی ریاست (Kingdom of Jerusalem)، مدینتہ الرہا کی ریاست (County of Edessa)، طرابلس کی ریاست (County of Tripoli) اور انطاکیہ کی ریاست (Principality of Antioch)۔

5.5 دوسری صلیبی جنگ

پہلی صلیبی جنگ کے تقریباً 47 سال بعد دوسری صلیبی جنگ کا آغاز ہوا۔ 1147ء سے 1149ء کے درمیان لڑی جانے والی اس جنگ کا اعلان پوپ ایوگین سوم (Eugene III) نے کیا۔ گو اس سے قبل مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی

رہیں اور کچھ علاقے مزید مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر عیسائیوں کے زیر نگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ پہلی صلیبی جنگ کے زیادہ تر مجاہدین یوروپ واپس لوٹ گئے تھے، اس لیے یروشلم کی لاطینی ریاست سمیت چاروں اتنی مضبوط نہیں رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے آپسی اختلافات اور مسلمانوں سے ہونے والی لگاتار کشمکش نے صورتحال کو اور زیادہ ناموافق کر دیا تھا۔ ان چاروں ریاستوں میں الرہا کی ریاست شمال کی آخری حدود تھیں۔ اس کی آبادی بھی سب سے کم تھی اور عسکری قوت بھی اوروں کی بہ نسبت کم تھی۔ چنانچہ قرب وجوار کی مسلم قوتیں اس پر اکثر حملہ آور ہوتی رہیں۔

1104ء میں الرہا کے حکمراں بالڈون دوم اور انطاکیہ کے حاکم بوہیمنڈ اول نے مزید توسیع کے لیے حران پر حملہ کر دیا، جس کے دفاع کے لیے موصل کا گورنر جکرمش (Jikirmish) آگے بڑھا۔ 7 مئی 1104ء کو حاکم موصل اور اس کے ہمنواؤں کی فوج نے حران پر اپنا قبضہ قائم کر لیا۔ پہلی صلیبی جنگ کے بعد حران کا معرکہ مسلم و عیسائیوں کے درمیان پہلا اہم تصادم تھا۔ اسی دوران دو مذہبی فوجی گروپ وجود میں آئے۔ یہ 'ہاسپٹلرز اور ٹیمپلرز' کہلاتے تھے۔ یہ فلسطین کی مقدس سرزمین کی حفاظت کو اپنی ترجیح سمجھتے تھے۔ بیمار اور زخمی عیسائی فوجیوں کی خدمت اور دیکھ بھال ان کا نصب العین تھا۔

1130ء میں بالڈون دوم کی موت تک بیت المقدس کی ریاست کافی کمزور ہو گئی تھی۔ بارہویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی عسکری کشمکش اور سیاسی افراتفری سے عبارت رہی۔ 24 دسمبر 1144ء کو موصل کے حاکم اتابک زنگی نے الرہا پر حملہ کر دیا۔ اس وقت جیسولن دوم (Joscelin II) اپنی پوری فوج کے ساتھ شہر سے باہر مسلمانوں کے خلاف ایک دوسری مہم پر گیا ہوا تھا۔ زنگی نے الرہا پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح الرہا کی ریاست پہلی صلیبی ریاست تھی جس کا سقوط ہوا۔ ریاست کا بیشتر علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ حالانکہ Joscelin II ایک چھوٹے سے حصے پر بدستور حکمراں رہا۔

الرہا کا سقوط نہ صرف فوجی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی بہت اہم اور دور رس اثرات کا حامل تھا۔ ایک طرف مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کے حصول کے لیے اسے نقطہ آغاز سمجھا تو دوسری طرف فلسطین کے عیسائی باشندوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا۔ ساتھ ہی یوروپ کے باشندوں کو لگنے لگا کہ یروشلم کی ریسات کا وجود بھی ایک بڑے خطرے کی زد میں ہے۔

پہلی صلیبی جنگ میں پیٹر دی ہرمٹ نے عیسائیوں کو ترغیب دینے اور اکسانے کا کام کیا تھا۔ اس بار سینٹ برنارڈ نے عیسائیت کے مولد کی حفاظت کے لیے رائے بنانے اور جوش دلانے کا کام کیا۔ سب سے پہلے 1145ء کے اوائل میں زائرین نے یوروپ میں عوام اور ارباب حل وعقد تک اس سانحہ یعنی سقوط الرہا کی خبر دی۔ بشپ، جیالہ کے ہیوجز نے یہ پیغام پوپ ایوگن سوم (Eugene III) تک پہنچایا۔ پوپ نے یکم دسمبر 1145ء کو صلیبی جنگ کے لیے فرمان جاری کیا تاکہ صلیبی ریاستوں کا تحفظ کیا جا سکے، جس کے نتیجے میں پہلی صلیبی جنگ کے مقابلے میں زیادہ منظم اور مرکزیت رکھنے والی مہم عمل میں آسکی۔ اس بار جنگ میں صرف نائٹ، امراء یا عوام ہی شامل نہیں تھے بلکہ یوروپ کے کئی اہم اور بڑے حکمراں بھی اپنا کردار ادا کرنے کو تیار تھے۔ ان میں فرانس کا شہنشاہ لوئی ہفتم (Louis VII) پیش پیش تھا۔ کہا

جاتا ہے کہ اس نے 1300 قیدیوں کو ایک گرجا گھر میں زندہ جلا دیا تھا۔ اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے وہ دوسری صلیبی جنگ میں شامل ہوا۔ اس کے علاوہ پرتگال کا الفانسو اول، سسلی کا روجر دوم، یروشلم کا بالڈون سوم، ٹریپولی کا ریمنڈ دوم، الرہا کی ریاست کا جیسولن دوم، جرمنی کا کوناڑ سوم اور دیگر یوروپ کے کئی چھوٹے بڑے راجا اپنی فوجوں کے ساتھ اس مہم کا حصہ ہے۔ دوسری طرف اسلامی مملکتوں میں رومی سلطنت، دمشق کی بربر حکومت، مصر کی فاطمی حکومت اور الموردامارات دوسری صلیبی جنگ میں فریق ثانی کی حیثیت سے شامل ہوئیں۔ یہ جنگ کئی محاذوں پر لڑی گئی۔ عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان کئی جنگیں لڑی گئیں۔ مسلم کمانڈر ابن العداس نے الرہا کی لڑائی میں صلیبیوں کو شکست دی۔ دمشق کے مورچہ پر نور الدین زنگی نے بے مثال جراءت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صلیبیوں کو ناکام کیا۔ اس نے کئی محاذوں پر عیسائیوں کو شکست سے دوچار کیا۔ 25 اکٹوبر 1147ء کو ڈورلیم کی جنگ بھی اہمیت کے اعتبار سے کم نہیں ہے۔ کورنارڈ اور اس کی فوجوں کو سلجوق حکمراں نے پوری طرح تباہ کر دیا۔

دوسری صلیبی جنگ کے دوران مغرب میں ہونے والی کارروائیوں میں عیسائی افواج کو کامیابی ملی۔ لیکن مشرق میں صورتحال ان کے موافق نہیں ہو سکی۔ یروشلم کے راستے میں ایشیاء مائنر عبور کرتے ہوئے راستے کی دشواریوں کے سبب فرانس اور جرمن افواج کا ایک بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ دونوں کے تھوڑے سے فوجی ہی فلسطین تک پہنچ پائے، دمشق کا محاصرہ بھی کیا گیا لیکن وہ بھی ناکام رہا۔ ان ناکامیوں کے بعد زیادہ تر صلیبی فوجی یوروپ واپس لوٹ گئے۔ اس طرح دوسری صلیبی جنگ ختم ہو گئی۔ عیسائیوں کی یہ ناکامی خصوصاً مغربی یوروپ کے لیے باعث شرم تھی۔

5.6 تیسری صلیبی جنگ (1189-1192)

دوسری صلیبی جنگ کی مشرق وسطیٰ میں ہونے والی عیسائی ناکامیوں کا سلسلہ بارہویں صدی کے نصف آخر میں مزید بڑھ گیا۔ 1171ء میں سلطان صلاح الدین جو نور الدین زنگی کے ایک فوجی جنرل کے بھتیجے تھے، مصر کے زنگی گورنر اور نورالدین زنگی کے بعد خود سلطان بن گئے۔ انہوں نے شام اور مصر کو متحد کر کے صلیبی ریاستوں کی گھیرابندی کر لی۔ 1187ء میں انہوں نے 90 سال بعد بیت المقدس کو عیسائیوں سے واپس لے لیا اور مزید شمال کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا۔

دوسری صلیبی جنگ کی ناکامی نے صورتحال پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ زنگی سلطنت نے متحدہ شام پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ لیکن مصر کی فاطمی حکومت سے اس کا تصادم جاری تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا، جب صلاح الدین ایوبی نے شام کو بھی مصر میں ملا کر اپنی حکومت قائم کر لی، جس کے بعد انہوں نے صلیبی ریاستوں کو کمزور کرنے اور انہیں شام سے کھدیڑنے کی کوششیں کیں۔ صلاح الدین کی کامیابی نے عیسائی مملکتوں کے لیے خطرہ کی گھنٹی بجادی۔ اپنے مقدس مقامات کی حفاظت اور مسلمانوں کے قبضے سے انہیں آزاد کرانے کے لیے یوروپ کے شرق و غرب میں جوش کی ایک لہر سی اٹھتی چلی گئی۔ اس بار صلیبی افواج کے روح رواں تھے فرانس کا بادشاہ فلپ دوم، انگلینڈ کا رچرڈ اول اور جرمنی کا شہنشاہ فریڈرک باربردسہ۔ یہی سبب تھا کہ اس تیسری صلیبی جنگ کو King's Crusade کہا گیا۔

فریڈرک کی عمر تقریباً 70 سال تھی، لیکن وہ ایک بہادر سپاہی، تجربہ کار کمانڈر اور باصلاحیت منتظم تھا۔ عوام میں اس کی عزت تھی اور خواص اس کا احترام کرتے تھے۔ اکتوبر 1187ء میں صلاح الدین ایوبی کے یروشلم پر قبضے کے تین ہفتے بعد پوپ گریگوری ہشتم نے فریڈرک کو خط بھیجا، جس میں ایک نئی صلیبی جنگ کی تیاری کے لیے اسے حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ پوری تیاری اور صورتحال کے مکمل جائزہ کے بعد اس مہم میں شامل ہو گیا۔ اس کی فوج نے یروشلم کے لیے اسی راستے کو اختیار کیا جو پہلی صلیبی جنگ کی افواج نے اپنایا تھا۔ انہیں رسد اور پانی کی کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ مسلم فوجی راستے میں گوریلا جنگ کے طرز پر ان کے اوپر حملہ کرتے رہے، جس سے کافی نقصان اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سپاہیوں کے حوصلے بلند تھے اور انہیں اپنے قائد پر بھرپور اعتماد تھا۔ وہ منظم تھے چنانچہ آگے بڑھتے رہے۔ ان کی اس پیش قدمی سے صلاح الدین کو تشویش ہوئی، لیکن قسمت اس کے ساتھ تھی۔ فریڈرک کی فوج جب ایشیاء مائنر میں سیلیف ندی عبور کر رہی تھی، شہنشاہ کی ندی میں ڈوب کر موت واقع ہو گئی۔ مایوس و دل شکستہ جرمن فوج بڑی مشکل سے وطن واپس لوٹ سکی۔ فریڈرک کی لاش انطاکیہ میں دفن کر دی گئی۔ اس طرح تیسری صلیبی جنگ میں جرمن افواج کا کوئی خاطر خواہ حصہ نہیں رہا۔

تیسرے صلیبی جنگ کے باقی دو قائد انگلینڈ کا رچرڈ اور فرانس کا فلپ نہ صرف کم عمر تھے بلکہ آپس میں بھی حریفانہ تعلق رکھتے تھے۔ رچرڈ شان و شوکت کا دلدادہ تھا جبکہ فلپ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ رچرڈ کچھ جھگڑالو طبیعت رکھتا تھا۔ سائیرس پہنچنے پر اس نے شہزادی بیرنگریا سے شادی کر لی۔ جبکہ فلپ کی بہن املیس اس کی منگیتر تھی۔ رچرڈ کی ان حرکتوں سے فلپ یقیناً ناراض تھا۔ اس کے علاوہ فلپ فلسطین پہنچ چکا تھا اور رچرڈ ابھی راستے میں ہی تھا اور لگتا تھا کہ اسے وہاں پہنچنے کی کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔

فلپ کی فوج عکرہ (Acre) پہنچ کر بندرگاہ کے باہر خیمہ زن ہو گئی۔ یہ شہر مسلمانوں کی چھاؤنی تھا۔ فلپ کی فوج کے ارد گرد مسلم افواج تھیں۔ عکرہ اور ارد گرد کے عیسائی رچرڈ کے منتظر تھے۔ 8 جون 1191ء کو رچرڈ عکرہ پہنچ گیا۔ 12 جولائی 1191ء کو عکرہ فتح کر لیا گیا۔ رچرڈ نے چھاؤنی کے فوجیوں اور ان کے خاندانوں کو قید کر لیا اور ہتھیار ڈالنے کے باوجود سب کو قتل کر دیا۔ اسی دوران فلپ اپنی گرتی ہوئی صحت اور فرانس کی صورتحال کی وجہ سے وطن واپس لوٹنے کے بے چین تھا۔ اس کا ایک سبب رچرڈ سے اس کے کشیدہ تعلقات بھی تھے۔ رچرڈ نے جرمن افواج اور ان کے نئے رہنما لیوپولڈ کے تئیں بھی اچھے رویہ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ فلپ کی فرانس واپسی کے بعد رچرڈ بنا دیر کیے یروشلم کی جانب بڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے عکرہ کے بچے ہوئے 27 ہزار قیدیوں کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یروشلم کے راستے میں جافا سے قبل آرسوف میں اس نے ترکوں کو شکست دی لیکن پھر بھی یروشلم کو مسلمانوں سے واپس لینے کا اس کا خواب پورا نہیں ہوا۔ جافا پر اس نے قبضہ کر لیا تھا اور اس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ یہاں صلاح الدین سے صلح کی گفتگو شروع ہوئی جو اولین مرحلے پر ناکام ہو گئی۔ جافا پر صلاح الدین نے دوبارہ قبضہ کر لیا، لیکن رچرڈ نے بحری حملہ کر کے جلد ہی اسے واپس لے لیا۔

رچرڈ اور عیسائی افواج کو یہ چھوٹی کامیابیاں تو مل رہی تھیں، لیکن یروشلم پر قبضہ کرنے میں وہ ناکام رہے۔ بالآخر ستمبر 1192ء میں صلاح الدین اور رچرڈ میں ایک سمجھوتہ ہو گیا، جس کے مطابق یروشلم پر صلاح الدین کا قبضہ برقرار رہا۔ البتہ عیسائی اسلحہ کے بغیر یروشلم میں

مقدس مقامات کی زیارت کر سکتے تھے۔ رچرڈ کی تمام کامیابیوں کے باوجود حتمی کامیابی صلاح الدین ایوبی کے ہی حصے میں آئی۔ واپسی میں رچرڈ کا جہاز حادثہ کا شکار ہو گیا اور وہ آسٹریا کے ڈیوک لیوپولڈ کے ہاتھ لگ گیا جو اس سے ناراض تھا۔ اس نے رچرڈ کو قید کر لیا۔ تقریباً ایک سال بعد بھاری تاوان کے بدلے انگریزا سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔

5.7 چوتھی صلیبی جنگ (1202-1204ء)

یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کرانے اور مصر کی ایوبی سلطنت کو شکست دینے کے لیے پوپ انوسینٹ سوم (Innocent III) نے ایک فوجی مہم کے لیے لاطینی عیسائیوں سے اپیل کی۔ تیسری صلیبی جنگ کے ادھورے کام کو پورا کرنے کے لیے صلیبی پہلے سے تیار تھے۔ اس مہم کا آغاز دراصل ایک سمجھوتہ سے ہوا جو صلیبی مجاہدین (Crusaders) اور اہالیان وینس کے درمیان تھا۔ اس کے مطابق مجاہدین ایک بڑی رقم کے بدلے جہاز اور رسد حاصل کر سکیں گے۔ لیکن وہ یہ بھاری معاوضہ ادا نہیں کر پائے۔ چنانچہ وینیسیئن نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ رقم کے بدلے ڈالمیشیا میں واقع زار (Zara) شہر میں ہونے والی بغاوت کو دبانے میں مدد کریں گے۔ اس کے لیے صلیبی مجاہد تیار ہو گئے، حالانکہ پوپ اُن کے اس قدم سے ناراض ہوا، مگر انہوں نے وعدہ کے مطابق زارا کے باغیوں کے خلاف کارروائی میں حصہ لیا۔ اس میں انہیں کچھ فائدہ لوٹ کی شکل میں بھی حاصل ہوا۔ ان سب کے باوجود صلیبی جنگجو فوراً مصر کی جانب روانہ نہیں ہو پائے۔ دراصل اسی درمیان قسطنطنیہ میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ وہاں ایک بغاوت ہوئی جس میں حکمراں آئیزک اینجلیس II کو گدی سے اتار دیا گیا۔ اس کے بیٹے الیکسیس اینجلس (Alexious Angeles) نے جنوری 1203ء میں صلیبی فوج سے مدد کی اپیل کی۔ اپنے مقاصد کے پیش نظر انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ وینیسین نے بھی اپنے تجارتی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے جنگجوؤں کا ساتھ دیا۔ نتیجتاً مرکزی فوج جون 1203ء میں تقریباً تین سو جہازوں میں سوار ہو کر قسطنطنیہ کی جانب عازم سفر ہوئی۔ باقی ماندہ فوج پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے مطابق عکرہ (Acre) کی طرف سرگرم سفر ی رہی۔ قسطنطنیہ پہنچ کر اس فوج نے وعدہ کے مطابق الیکسیس کا ساتھ دیا اور کامیاب رہے۔ لیکن الیکسیس نے وعدہ خلافی کی اور وہ معاوضہ نہیں دیا جو فوجیوں سے طے ہوا تھا۔ ہنگاموں کے دوران الیکسیس مارا گیا۔ فوج نے شہر کو لوٹ لیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

1204ء میں انہوں نے دوبارہ لاطینی ریاست قائم کر کے فلینڈرس بالڈون کو شہر سونپ دیا اور حکمراں کی حیثیت سے اسے تخت نشین کر دیا۔ ریاست کے ایک بڑے علاقے کو فرینک نائٹون کے قبضے میں جاگیر کی حیثیت سے رہنے دیا۔ قسطنطنیہ سے نمٹنے کے بعد بہت سے اہم صلیبی قائدین اور ان کے ہمنواؤں نے آگے کی طرف بڑھنے اور یروشلم کی بازیابی کا قصد ترک کر دیا۔ بہت کم حصہ میں فوج کا اپنے مقصد کے حصول کے لیے روانہ ہوا۔ قسطنطنیہ میں قائم لاطینی ریاست بہت دن تک اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ پائی۔ 1261ء میں گریک نے اس پر قبضہ کر لیا جو 1453ء تک جاری رہا، جب ترکوں کا تسلط قائم ہو گیا۔

5.8 دیگر صلیبی جنگیں

سرزمین فلسطین کے حصول اور مقامات مقدسہ کے تسلط کے لیے عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو جنگیں لڑیں، وہ صلیبی جنگیں (Crusade) کہلاتی ہیں۔ اوپر ہم نے اُن چار بڑی اور اہم لڑائیوں کا جائزہ لیا جن میں دونوں فرقوں نے بڑے پیمانے پر حصہ لیا یا اُن کے اثرات اور دائرہ زیادہ بڑے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی نسبتاً چھوٹے پیمانے پر اسی مقصد کے لیے دونوں فرقے باہم متصادم ہوئے۔ ان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس وقت کی یورپ اور مشرق وسطیٰ کی عمومی صورتحال پر ان واقعات کا گہرا اثر ہوا۔ دو بڑے آسمانی مذاہب کے ماننے والوں کی باہمی کشاکش سیاسی، سماجی، معاشی اور جغرافیائی تبدیلیوں کا باعث بنی۔

5.8.1 بچوں کی صلیبی جنگ

بچے اپنے ارد گرد کے ماحول اور اس میں ہونے والے واقعات سے کیسے اور کتنا متاثر ہوتے ہیں، اس کا اندازہ 1212ء میں یورپ میں ہونے والی بچوں کی اس مہم سے ہوتا ہے، جس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی تھی۔ بچوں کی اس تحریک کا روح رواں ایک فرانسیسی کسان اسٹیفن تھا۔ اس کا یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ ان مقامات مقدسہ کو آزاد کرائے۔ اس کی باتوں سے بچے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اتنے جوش میں بھر گئے کہ اُنہیں گھروں میں روکنا ناممکن ہو گیا۔ تقریباً 20 ہزار سے لے کر 40 ہزار تک بچے سب سے پہلے جرمنی سے اس مہم پر نکلے۔ ان میں 12 سال سے بھی کم عمر کے بچے شامل تھے۔ یہ کوہ آلپس عبور کر کے اٹلی کے سمندری ساحل تک پہنچ گئے۔ انہیں اُمید تھی کہ سمندر میں معجزاتی طور پر سڑک نمودار ہو جائے گی جس پر چل کر وہ فلسطین پہنچ جائیں گے۔ روم کے راستے میں بہت سے بچے ہلاک ہو گئے اور جو روم پہنچے اُنہیں پوپ نے یہ سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیا کہ بڑے ہو کر وہ اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ تقریباً 30 ہزار فرانسیسی بچے بھی مارسلیز میں اکٹھا ہوئے۔ لیکن سامنے عظیم سمندر کی موجیں لہراتی دیکھ کر اُنہیں مایوسی ہوئی۔ زیادہ تر بچے واپس گھروں کو لوٹ گئے۔ لیکن کچھ بچے تاجروں کے دو جہازوں پر اس یقین دہانی پر سوار ہو گئے کہ اُنہیں بنا معاوضہ فلسطین پہنچا دیا جائے گا، مگر اُن کے ساتھ فریب ہوا اور وہ غلاموں کے بازار میں بیچ دیئے گئے اور کچھ جہاز کے حادثے میں شکار ہونے کے سبب ڈوب گئے۔ اس طرح بچوں کی صلیبی مہم انجام کو پہنچی۔

5.8.2 دیگر صلیبی مہمات

مذہبی نصب العین کے کچھ چھوٹی جنگیں بھی لڑی گئیں۔ یہ عام جنگیں تھی جنہیں پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صلیبی جنگ بھی کہا گیا۔ 1216ء سے 1220ء تک پانچویں صلیبی جنگ کی قیادت ہنگری اور سائیرس کے بادشاہوں نے کی۔ اس مہم پر جن جنگجوؤں نے حصہ لیا، اُن میں سے زیادہ تر مصر میں مارے گئے۔ ان کی کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ بھی نہیں نکلا۔ چھٹی صلیبی جنگ جرمن شہنشاہ فریڈرک دوم کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ وہ مسلمانوں سے کچھ علاقے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتویں صلیبی تصادم کا قائد فرانس کا لوئی نہم (Louis IX) تھا۔ 124ء سے 1254ء کے درمیان ہونے والی اس کی سبھی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اس سلسلے کی آٹھویں کوشش فرانس کے لوئی نہم اور انگلستان کے شہزادے ایڈورنے مل کر کی۔ یہ شمالی آفریقہ میں تیونس پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں طاعون کے سبب ہنری نہم کی موت ہو گئی۔

لیکن ایڈور کو کچھ کامیابی ضرور ملی اور اس نے 1272ء میں مصر کے خلیفہ سے عیسائیوں کے لیے کچھ سہولیات حاصل کر لیں۔ مذکورہ بالا صلیبی جنگیں نہ تو بہت زیادہ منظم تھیں اور نہ ہی اُن میں شروع کی چار بڑی صلیبی جنگوں کی طرح عیسائیوں کی شمولیت ہوئی۔ جنگجوؤں کا جوش بھی کم ہو چکا تھا۔ صلیبیوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ملکوں کو واپس لوٹ چکی تھی۔ 1291ء میں یروشلم کی بازنطینی ریاست کے ختم ہونے سے صورتحال تبدیل ہوئی تھی۔

5.9 صلیبی جنگوں کی اہمیت اور ان کے اثرات

طویل اور سخت جدوجہد کے باوجود یوروپی عیسائی مشرقی علاقوں میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کر پائے۔ البتہ یوروپ نے جنوب مغرب اور شمال مشرق میں انہوں نے مسلمانوں سے بہت سے علاقے چھین لیے جو آگے چل کر پرتگال، اسپین اور یروشا جیسے ممالک کا حصہ بنے۔ عیسائی یوروپ کی مذہبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور صنعتی زندگی پر ان صلیبی جنگوں نے دوررس اثرات مرتب کیے۔ ایشیا بھی ان سے کچھ کم متاثر نہیں ہوا۔ انسانی تہذیب کے تاریخی ارتقاء میں ان صلیبی جنگوں کا کردار بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے ملاپ نے ایشیا اور خصوصاً یوروپ میں زندگی کے ہر پہلو پر اپنا اثر ڈالا۔ فرانس میں جمہوریت کا آغاز، یوروپ میں شہری تہذیب کی ابتداء، بین الاقوامی تجارت میں توسیع، جاگیرداری نظام کا زوال اور نشاۃ ثانیہ یہ سب کسی نہ کسی شکل میں صلیبی جنگوں سے کم یا زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

صلیبی جنگوں نے پاپائیت کے نظام کو مضبوط کرنے میں بھی معاونت کی۔ تقریباً دو سو سال تک عیسائی دنیا کی عسکری اور معاشی معاونت پوپ کو حاصل رہی، جس نے بلاشبہ ان کی توقیر، اثر ورسوخ اور دولت و ملکیت میں اضافہ کیا۔ کلیسا اور ریاست کے مابین ہونے والی کشمکش میں یہ پوپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ ریاست کے اوپر پوپ کی روحانی فوقیت ان جنگوں نے ثابت کر دی۔ فرانس، انگلینڈ اور جرمنی وغیرہ کے بادشاہ بھی جنگوں کے دران پوپ کے مطیع ہی سمجھے جاتے تھے۔ ٹیکس اور تحائف وغیرہ سے پوپ اور کلیسا دونوں کی آمدنی میں زبردست اضافہ ہوا۔ صلیبی جنگوں نے پوپ اور کلیسا کو فائدہ کے علاوہ کچھ نقصانات بھی پہنچائے۔ صلیبی جنگوں کی ناکامی ہی نہیں بلکہ پوپ کے ذریعہ بادشاہوں کے خلاف بھی اس کے استعمال نے پوپ کی مقبولیت میں کمی پیدا کی۔ یہی نہیں خانقاہوں میں آنے والی دولت اپنے ساتھ بدعنوانیاں بھی لے کر آئی، جس نے اس نظام کو زوال پذیر کیا۔

سیاسی نقطہ نظر سے بھی صلیبی جنگوں کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جاگیرداروں کی طاقت میں کمی آئی اور طاقتور بادشاہت کے راستے آسان ہو گئے۔ جاگیرداروں کی املاک بادشاہوں نے خرید لی، بہت سے جاگیردار لوٹ کر ہی نہیں آئے۔ چنانچہ بادشاہ کی حیثیت مضبوط ہوئی۔ مختلف ریاستوں اور علاقوں کے فوجیوں کے ملاپ نے قومیت کے عنصر کو بڑھاوا دیا۔ ان فوجیوں کے آپسی اختلافات اور اپنے اپنے علاقوں کے تئیں ان کے جذبات نے حریفانہ کشمکش پیدا کی جس کے نتیجے میں قومیت کا تصور واضح طور پر نمودار ہوا۔ یہ صورتحال خاص طور سے فرانس، انگلینڈ اور جرمنی جیسے ممالک میں دکھائی دی۔

سماجی و معاشی زندگی پر صلیبی جنگوں نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ حالانکہ یوروپ کے شہر اور گاؤں پہلے سے ہی جاگیر دارانہ غلامی سے آزادی کے راستے پر گامزن تھے، لیکن ان جنگوں نے اس کی رفتار تیز کر دی۔ صنعت و تجارت کی ترقی نے بھی عوام کے ایک بڑے حصے کی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ عورتوں کی سماجی و معاشی حیثیت میں تبدیلی آئی۔ مردوں کے جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے عورتوں نے اُن کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جس سے اُن کی معاشی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ ان جنگوں نے رہن سہن، لباس، غذا اور رسم و رواج پر بھی اثر ڈالا۔ زندگی کے ان پہلوؤں پر ایشیا کے پرتو یوروپ میں نظر آنے لگا۔ مثلاً عربوں و ترکوں کے مانند یوروپ میں بھی داڑھی کا چلن بڑھ گیا۔ یہاں کے باشندوں میں بھی مکئی، دھان، لیموں، تربوز، مصالحہ جات، قالین، دری وغیرہ کا استعمال بڑے پیمانے پر ہونے لگا۔

جنگی و دفاعی میدان میں بھی ہمیں صلیبی جنگوں کے اثرات بہ آسانی نظر آتے ہیں۔ یوروپ میں وسیع و عریض اور مضبوط قلعوں کی تعمیر ہونے لگی۔ ان کی گھیرا بندی کا طریقہ ایشیا سے ہی وہاں پہنچا۔ ڈوری والے کمان اور پیغام رساں کبوتروں کا استعمال بھی ایشیا ہی کی دین ہے۔ ایشیاء و یوروپ کی آمیزش نے لوک گیت، کہانی، تاریخ نویسی اور طب وغیرہ میں بھی نئی جہتیں پیدا کیں۔ عربی تراجم کے ذریعے ہی ارسطو دوبارہ یوروپ واپس آسکا۔ یونانی علم نجوم اور ہندوستانی ریاضی بھی عربوں کے ذریعے ہی یوروپ پہنچی۔ صلیبی جنگوں نے جغرافیائی دریافتوں اور بحری مہمات کے لیے مواقع اور آسانیاں فراہم کیں۔ غالباً 1280ء میں یوروپ کا پہلا نقشہ تیار کیا گیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صلیبی جنگوں نے صرف مذہبی اور سیاسی میدانوں میں ہی اپنا فعال کردار ادا نہیں کیا، بلکہ حقیقتاً انسانی حیات اور سماج کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا بچا ہو جہاں ان کے اثرات دکھائی نہ دیں۔

5.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بیت المقدس کی سرزمین، فلسطین دنیا کے تین بڑے آسمانی مذہب کے پیروکاروں مسلم، یہودی اور عیسائیوں کے نزدیک یکساں طور پر مقدس سمجھی جاتی ہے۔ قدیم عہد سے ہی اس پر تسلط کے لیے ایک دوسرے کے خلاف حملے ہوتے رہے ہیں۔ یہودیوں سے یہ عیسائیوں کے قبضے میں چلی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم کے عہد میں اس پر مسلمانوں نے فتح حاصل کرلی، جس کے بعد طویل عرصہ تک یہ علاقہ مسلمانوں کے ہی زیر نگیں رہا۔ 12ویں صدی کے اخیر حصے میں یوروپ میں عوام و خواص میں ایک لہر اُٹھی جو مذہبی جوش سے بھر پور تھی۔ مذہبی اور حکمراں طبقات قیادت کے لیے تیار تھے۔ نتیجتاً سیاسی و مذہبی صورتحال نے عیسائیوں اور مسلمانوں کو باہم متصادم کر دیا۔ عیسائی عوام اور حکومتیں عسکری قوت کی بنیاد پر یروشلم کی آخری دہائی سے تیرہویں صدی کے اخیر حصے تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان چار بڑی اور کچھ دیگر چھوٹی جنگیں لڑی گئیں۔ انہیں صلیبی جنگیں کہا جاتا ہے۔ ایشیاء اور خصوصاً یوروپ میں انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو ان جنگوں نے متاثر کیا اور نئی تبدیلیوں کا سبب بنیں۔

1095ء میں پوپ اربن دوم نے فرانس کے شہر کلرمونٹ میں عیسائیوں سے مسلمانوں کے خلاف جہاد کی اپیل کی، جس کے بعد 1096-1099 کے درمیان پہلی صلیبی جنگ لڑی گئی۔ آغاز میں ایک فرانسیسی پادری پیٹر دی ہرمٹ کی قیادت میں عوام یوروپ سے نکلے،

لیکن منظم ترک فوج کے ہاتھوں شکست کھا کرن میں سے بیشتر ہلاک ہو گئے۔ جس کے بعد یوروپ کے طاقتور بادشاہوں کی سرکردگی میں کئی لاکھ افراد پر مشتمل فوج مشرق وسطیٰ کی جانب بڑھی۔ یہ فوج لگاتار کامیابی حاصل کرتی رہی۔ یہاں تک کہ یروشلم کو بھی فتح کر لیا۔ 1099ء میں یروشلم پر قبضہ کے ساتھ صلیبی مجاہدین نے اپنے تمام مقامات مقدسہ کو مسلمانوں سے آزاد کرالیا۔ فاتحین نے چار صلیبی ریاستیں، یروشلم، الرہا، تریپولی اور انطاکیہ قائم کیں۔

دوسری صلیبی جنگ 1149-1147 کے درمیان لڑی گئی۔ اس میں یوروپ کے اہم ممالک کے بڑے حکمرانوں نے حصہ لیا۔ دراصل 1144ء میں موصل کے حاکم نے الرہا پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے عیسائیوں کو بے دخل کر دیا تھا۔ اس کی واپسی کے لیے عیسائی افواج حملہ آور ہوئیں۔ کئی محاذوں پر لڑائیاں ہوئیں، لیکن مشرق میں عیسائیوں کو کوئی کامیابی نہیں ملی اور وہ بے نیل و مرام واپس ہوئے۔ تیسری صلیبی جنگ کی بنیادی وجہ مصر کے حاکم صلاح الدین ایوبی کی پیش قدمی تھی۔ اس نے 1187ء میں یروشلم پر قبضہ کر لیا تھا اور مزید عیسائی مملکتوں کی طرف اس کی نگاہ تھی۔ چنانچہ یروشلم کو واپس لینے اور صلاح ایوبی کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے تیسری صلیبی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس میں انگلینڈ، فرانس اور جرمنی سمیت یوروپ کے بڑے حکمراں اپنی افواج کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف مورچہ بند ہوئے۔ 1189 سے 1192 تک درمیان یوروپ و ایشیاء کے کئی علاقوں میں لڑائیاں جاری رہیں۔ لیکن اس بار عیسائیوں کو کوئی کامیابی نہیں ملی، وہ یروشلم کو آزاد تو نہیں کرا پائے البتہ وہاں عیسائی زائرین کے لیے کچھ سہولیات ضرور حاصل کر لیں۔ چوتھی صلیبی جنگ بھی یروشلم کو آزاد کرانے اور ایوبی سلطنت کو شکست دینے کے لیے لڑی گئیں۔ لیکن آغاز میں ہی صلیبی جنگجو اپنے مقصد سے بھٹک گئے۔ قسطنطنیہ کی سیاست میں پھنس کر یروشلم کے حصول کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ جنگ بھی بغیر کسی کامیابی کے ختم ہوئی۔ ان چار اہم جنگوں کے علاوہ چار دیگر نسبتاً چھوٹے معرکہ بھی فریقین کے درمیان ہوئے۔ ساتھ ایک مہم بچوں کی جس میں بارہ سال سے کم عمر کے بچے بھی تھے، کی بھی اسی کشمکش کا حصہ ہے۔ مذکورہ صلیبی جنگیں تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ خاص طور پر ایشیاء اور یوروپ کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ علمی و فنی اور صنعتی و تجراتی میدانوں میں بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے امتزاج سے نئی جہتیں نمودار ہوئیں۔

5.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

صلیبی جنگ	:	عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان یروشلم کے حصول کے لیے لڑی جانے والی جنگ۔
ہیکل	:	یہودیوں کی مقدس عبادت گاہ۔
مسجد اقصیٰ:		یروشلم میں تعمیر ہونے والی مسجد
بیت اللحم	:	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش
نائٹ	:	عہدِ وسطیٰ کے نڈر تربیت یافتہ جنگجو
ٹیمپلرز	:	خانقاہی نظام سے وابستہ افراد جو مستقل فوجیوں میں تبدیل ہو گئے۔

5.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. یروشلم کس براعظم میں واقع ہے؟

(الف)یورپ (ب)افریقہ (ج)ایشیا (د)آسٹریلیا

2. ہیکل (Temple) کس پیغمبر کے نام سے منسوب ہے؟

(الف)حضرت موسیٰؑ (ب)حضرت داؤدؑ (ج)حضرت سلیمانؑ (د)حضرت ابراہیمؑ

3. یروشلم کس خلیفہ کے دور میں مسلمانوں کے قبضے میں آیا؟

(الف)حضرت ابو بکرؓ (ب)حضرت عمر بن خطابؓ (ج)حضرت عثمانؓ (د)حضرت علیؓ

4. ایشیائے کوچک (Asia Minor) کس علاقے کو کہا جاتا ہے؟

(الف)شام (ب)ایران (ج)اناطولیہ (د)مصر

5. پہلی صلیبی جنگ کے لیے یورپیوں سے اپیل کس پوپ نے کی؟

(الف)پوپ گریگوری ہفتم (ب)پوپ اربن دوم (ج)پوپ انوسنٹ سوم د)پوپ جیلاسیئس اول

5.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صلیبی جنگوں کے سیاسی اسباب پر روشنی ڈالیے۔
2. عوامی صلیبی جنگ پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. تیسری صلیبی جنگ میں رچرڈ کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

5.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. صلیبی جنگوں کے پس پشت کارفرما عوامل کا تفصیل سے تجزیہ کیجیے۔
2. پہلی تین صلیبی جنگوں کے واقعات پر بحث کرتے ہوئے عیسائیوں کی کامیابی کا جائزہ لیجیے۔
3. صلیبی جنگوں نے ایشیا و یوروپ پر کیا اثرات مرتب کیے؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

جوابات

1۔(ج)ایشیا 2۔(ج)حضرت سلیمانؑ 3۔(ب)حضرت عمر بن خطابؓ 4۔(ج)اناطولیہ

5۔(ب)پوپ اربن دوم

اکائی 6۔نشاۃثانیہ کی تمہید

(Prelude of Renaissance)

اکائی کے اجزاء

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 تاریخی پس منظر

6.3 عہدِ وسطیٰ کے آخری مرحلے میں یوروپ کی صورتحال

6.4 نشاۃثانیہ کے ابتدائی آثار

6.4.1 کیرولنجیائی تحریک

6.4.2 الیجینسین تحریک

6.4.3 فریڈرک دوم اور نشاۃثانیہ

6.4.4 نشاۃثانیہ کا پیش رو ادیب دانتے

6.5 عیسائی مذہب اور کلیسا

6.6 معاشی و معاشرتی عناصر

6.7 نشاۃثانیہ اور صلیبی جنگیں

6.8 نشاۃثانیہ اور اٹلی

6.9 اکتسابی نتائج

6.10 کلیدی الفاظ

6.11 نمونہ امتحانی سوالات

6.0 تمہید (Introduction)

نشاۃ ثانیہ کا مطلب ہے دوبارہ سے جاگنا، دوبارہ سے پیدا ہونا، کسی شئے کی تجدید ہونای کرنا۔ یوروپ کے تاریخی پس منظر میں یہ لفظ زیادہ وسیع المعنی ہے اور تاریخ کے ایک اہم مرحلے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یوروپ کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں پندرہویں اور سولہویں صدیاں ایک نئے دور سے آشنا ہوئیں، جسے دانشوروں نے نشاۃ ثانیہ کا نام دیا۔ اس دور میں ادب، سائنس اور مختلف علوم وفنون میں نئی جہتیں سامنے آئیں ، جنہوں نے زندگی کے تمام شعبوں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور زندگی کے تئیں نئے نظریات وافکار کی داغ بیل ڈالی۔ ٹامسن جانسن کے مطابق مورخین لفظ نشاۃ ثانیہ کا اطلاق آرٹس و سائنس میں ہوئی اس بیدری کے لیے کرتے ہیں جس نے پندرہویں صدی عیسوی میں اٹلی کی تہذیب وثقافت میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ چودھویں صدی میں اس کی ابتداء ہوئی اور سولہویں صدی عیسوی تک یہ لہر کوہ آلپس پار کر کے پورے یوروپ میں پھیل گئی۔ مورخ سوین کا کہنا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے اواخر میں یوروپ کے اندر عقل ودانش کے اعتبار سے جو بھی ترقی ہوئی اسے ہی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ نشاۃ ثانیہ صرف افکار و نظریات کی ترقی کا ہی نام نہیں تھا بلکہ اس نے مادی اور عملی زندگی میں بھی نئے سنگ میل قائم کیے۔ یہ ایک ایسی دانشورانہ تحریک تھی جس نے ٹھوس ٹائج پیدا کیے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- اُن عوامل کی بتداءاور اس صورت حال سے واقف ہو جائیں گے جو اس کا پیش خیمہ تھی۔
- یوروپ میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں۔
- عہدِ وسطیٰ کے آخر میں مختلف علوم وفنون کی صورتحال سے آگاہ ہو سکیں۔

6.2 تاریخی پس منظر

عموماًیوروپ کے عہدِ وسطیٰ کو تاریک دور کہا جاتا ہے، لیکن یہ بات پوری صحیح نہیں ہے کیونکہ اس دور کے آخری مرحلے میں ہمیں یوروپی سماج میں ایسی کچھ تبدیلیوں کے آثار نظر آتے ہیں جنہوں نے انسان کو بیدار کرنے وراس کے شعوری ارتقاء کو ایک نئی سمت دینے کا کام کی۔ یونانی ورومی تہذیبوں کی اعلیٰ قدریں اس تبدیلی کی رہنما ثابت ہوئیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس طرح کی تبدیلیاں اچانک نہیں ہو جاتیں بلکہ یہ ایک طویل عرص، کبھی کبھی تو صدیوں کے مسلسل عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جدید یوروپ کا آغاز نشاۃ ثانیہ سے ہوتا ہے، لیکن نشاۃ ثانیہ کی ابتداء جدید دور سے بہت پہلے عہدِ وسطیٰ میں نظر آنے لگتی ہے۔ حقیقتاً یہ تبدیلیاں اتنے غیر محسوس طریقے سے ہوتی ہیں کہ جو لوگ اس وقت موجود ہوتے ہیں انہیں بھی اندازہ نہیں ہو پاتا۔ مختلف تاریخی ادوار کے درمیان ایک ایساTransitional وقت بھی ہوتا ہے جس میں پرانے افکار و نظریات، قدریں اور رسم ورواج دم توڑ رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی نئے خیالات اپنی جگہ بناتے نظر آتے ہیں۔ یہ نئے نظریات ہی نئے دور کے نقیب ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نشاۃ ثانیہ، عہدِ وسطیٰ اور جدید دور کے درمیان کی کڑی ہے۔

یہ عمل یوروپ کے دونوں ادوار پر محیط ہے۔ وہ عناصر جو نشاۃ ثانیہ کی تشکیل میں شامل ہیں اور جنہوں نے اس عمل کو مکمل کیا، ان کی داغ بیل عہدِ وسطیٰ میں ہی پڑ چکی تھی۔ یوروپ کے وسطی دور کی سماجی، معاشی اور علمی زندگی میں وہ ہلچل پیدا ہونے لگی تھی جس نے دورِ جدید کی بنیاد ڈالی۔ سیاسی و مذہبی سطح پر وہ سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں، جنہوں نے اپنی حتمی شکل میں جدید یوروپ کو جنم دیا۔ ہم اس اسکائی میں آگے ان کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

6.3 عہدِ وسطیٰ کے آخری مرحلہ میں یوروپ کی صورتحال

عہدِ وسطیٰ کے یوروپ میں سماجی و مذہبی سطح پر بڑی دوررس تبدیلیاں ہوئیں۔ مذہبی میدان میں رومن کیتھولک چرچ اور اس کے سب سے اعلیٰ عہدیدار یعنی پوپ کی طاقت میں زبردست اضافہ ہوا۔ پوپ کسی شہنشاہ ہی کی طرح ہر آسائش زندگی گذارتا تھا۔ چرچ کرپشن اور بدعنوانیوں کے مرکز بن گئے تھے، جہاں دولت کی کثرت تھی۔ مذہب کے نام پر طویل عرصوں پر محیط جنگیں لڑی گئیں۔ اسلام کا آغاز اور اس کا عروج ایک اہم تاریخی واقعہ تھا، جس کے نتیجے میں عرب ایک عظیم الشن سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس میں شمالی آفریقہ، سسلی کے ٹاپو اور جنوبی اسپین شامل تھے۔ یہی نہیں عرب دنیا کی ایک بڑی تجارتی قوت بھی بن گئے۔ عرب نے یوروپ کی صرف معاشی زندگی پر ہی اثر نہیں ڈالا بلکہ انہوں نے مشرق کے مختلف علوم و فنون خصوصاً سائنس و حساب کو مغرب تک پہنچایا۔ عرب کے ذریعے مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا سنگم ہوا جس نے افکار و نظریات میں انقلاب برپا کر دیا۔

اسی دور میں جاگیردارانہ نظام زوال کی طرف مائل تھا۔ اس میں تمام زمین کا مالک حکمراں تھا لیکن اس کا مکمل استعمال جاگیردار کرتا تھا۔ یہ نظام خود کفیل معیشت پر مبنی تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی سے تکنیکی اور معاشی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ آبادی میں اضافہ ہوا۔ نئی زرعی زمینوں کی تلاش میں جنگل صاف کیے جانے لگے۔ وبائی بیماریوں خصوصاً کالی موت (Black Death) نے زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ ان سب نے جاگیردارانہ نظام پر منفی اثرات چھوڑے اور اس کی تنظیم کمزور ہونے لگی۔ کسانوں نے اپنے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی، زرعی مزدوروں کی حالت بھی کچھ بہتر ہوئی۔ مجموعی طور پر جاگیرداری کی بنیاد کمزور ہو گئی۔

تجارت کے میدان میں آٹھویں صدی عیسوی سے ہی زوال کے آثار نمایاں تھے اور اس صدی کے آخر تک زراعت یوروپ میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ لیکن گیارہویں سے تیرہویں صدی کے درمیان تجارت کی شکل و نوعیت میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس دور میں سمندری تجارت میں زبردست اضافہ ہوا۔ غرض کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوروپ اپنے وسطی دور کے نصف آخر میں مختلف تبدیلیوں کے گذر رہا تھا اور یہ تقریباً زندگی کے ہر اہم شعبے میں نظر آ رہی تھیں۔

6.4 نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی آثار

جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کی ابتداء یوروپ میں نہ تو اچانک ہی ہوئی تھی اور نہ ہی یہ کوئی اتفاقی واقعہ تھا، بلکہ اس کی علامتیں

یوروپی سماج میں بہت پہلے سے نظر آنے لگی تھیں۔ چودھویں صدی سے قبل بھی انفرادی واجتماعی سطح پر دانشورانہ غور وفکر کے مثالیں ملتی ہیں۔ ان افکار نو کی بنیاد سے قدیم تہذیب وثقافت کا عکس بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

6.4.1 کیرولنجیائی تحریک (Carolingian Movement)

آٹھویں صدی کے اواخر میں مغربی اور وسطی یوروپ کے ایک بڑے حصے پیں کیرولنجیائی سلطنت قائم تھی، جس میں فرانس، جرمنی، بلجیم، نیدرلینڈ، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا وغیرہ کے بہت سے علاقے شامل تھے۔ شہنشاہ چارلس اعظم کے دور میں اس نے نہ صرف سیاسی عروج حاصل کیا بلکہ مختلف علوم وفنون اور ثقافت کے اغیار سے بھی بلندیوں تک پہنچی۔ یوروپی نشاۃ ثانیہ کے اولین آثار اسی دور کی شناخت ہیں۔ شہنشاہ چارلس اعظم کی سرپرستی میں علماء ودانشوران نے قدیم رومی لاطینی زبان ومخطوطات اور تحریروں کی نہ صرف حفاظت کی طرف دھیان دیا، بلکہ ان کے مطالعہ وتحقیق کی جانب بھی راغب ہوئے۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد مذہبی گروہ اور نظم ونسق کے متعلق افراد وافسران کو تعلیم یافتہ بنانا اور مزید اہلیت پیدا کرنا تھا۔ لیکن اس نے قدیم علوم وفنون کی بازیابی اور نئے نظریات کی تشکیل کا کام بھی کیا۔ نتیجتاً لاطینی زبان کی ایک معیاری شکل وجود میں آئی، جسے 'وسطی لاطینی' (Medieval Latin) کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رسم الخط میں بھی تبدیلیاں ہوئیں، جس نے اختلافات ختم کرکے اس میں یکسانیت پیدا کی اور تحریر کو نقل کرنا آسان اور بہتر ہوا۔ محل وخانقاہوں میں اسکول قائم کرکے انہیں تعلیم کا مرکز بنایا گیا۔ آرٹ، آرکیٹکچر اور عبادات کے طریقوں میں اصلاح کی گئی۔ اس طرح کیرولنجیائی نشاۃ ثانیہ نے آئندہ عہدِ وسطیٰ میں ہونے والی دانشورانہ ترقی کی بنیاد ڈالی اور قدیم علوم وثقافت کا تحفظ کیا، جس نے مستقبل میں نشاۃ ثانیہ کے عمل میں اپنا کردار ادا کیا اور کچھ عرصے کے لیے یوروپ کی جہالت وظلمت میں چمک پیدا کردی۔ لیکن یہ تحریک دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ اہلِ علم کے مطابق شاید یہ لہر قبل از وقت آگئی تھی اور مجموعی طور پر یوروپ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ چارلس کی موت کے بعد بہت جلد اس کی روشن کی ہوئی شمع بھی بجھ گئی۔

6.4.2 البگنیائی تحریک (Albigensian Movement)

بارہویں اور تیرہویں صدی میں جنوبی فرانس کی یہ تحریک بھی نشاۃ ثانیہ کی تمہید میں شامل ہے۔ گو یہ مذہبی تحریک تھی لیکن مذہب سے زیادہ اس میں دانشورانہ پہلو غالب تھا۔ اس کے نتیجے میں بھی سماجی وادبی پہلوؤں سے ترقی ہوئی۔ اس کے پیروکار دہری کاسمولوی (Dual Cosmology) پر یقین رکھتے تھے۔ ایک نیک یعنی روحانی خدا، دوسری بد یعنی مادی خالق۔ انہوں نے مادی دنیا کو مسترد کیا۔ چنانچہ انہوں نے کیتھولک چرچ کی مخالفت کی کیونکہ یہ اخلاقی دیوالیہ پن کے شکار تھے اور قوت واقتدار کے حریص۔ انہوں نے کیتھولک فرقے کی بہت سے بنیادی رسوم وعبادات کو بھی مسترد کردیا۔ مثلاً بپتسمہ اور عشائے ربانی۔ کیتھولک چرچ نے ان کو بدعتی قرار دیا اور اس سیکولر وجدید افکار پر مبنی فرقے کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو۔ 1209ء سے 1229ء کے درمیان ان کے خلاف طاقت استعمال کی گئی، ہتھیار اٹھالیے گئے اور جبر وتشدد سے ان کو کچل دیا گیا۔ 1209ء میں پوپ انوسینٹ سوم نے اس تحریک کے خلاف البگنیائی صلیبی جنگ (Albigensian Crusade) کا آغاز کیا، جو تقریباً دو دہائیوں تک جاری رہی، زبردست تشدد کا مظہر ہوا اور جبراً مذہب تبدیل کرائے گئے۔ 1229ء میں

ان پر قابو پانے کے لیے انکویزیشین (Inquisition) قائم کیا گیا۔ 1224ء میں مانسٹیک یوآر قلعہ کے سقوط کے ساتھ اس تحریک نے دم توڑ دیا۔ کیتھر فرقہ کی اس ناکامی نے چرچ کے اقتدار کو مضبوط کیا اور علاقائی آزادی کو کمزور کرنے میں بھی تعاون کیا۔ لیکن یہ تحریک بے نتیجہ نہیں رہی۔ اس نے بعد کی مذہبی اصلاحی تحریکوں پر اپنا اثر ڈالا، مثلاً پروٹسٹنٹ نظریہ پر اس کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

6.4.3 فریڈرک دوم اور نشاۃ ثانیہ

فریڈرک دوم (1194-1250) جیسے فریڈرک اعظم بھی کہا جاتا ہے، گو حقیقی معنی میں نشاۃ ثانیہ کے عہد کا حکمراں ہیں تھا لیکن اپنے دور میں اس نے سیاسی، سماجی، مذہبی و علمی اور معاشرتی میدانوں میں جو قدم اٹھائے، ان میں نشاۃ ثانیہ میں کارفرما عوامل کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ وہ اپنے عہد سے کئی صدیاں آگے کی شخصیت تھا۔ مذہبی رواداری اور ذہنی آزادی کا قائل تھا۔ یونان و روم کی قدیم تہذیب اور مشرق و مغرب کے سماجی و مذہبی نظام کے اثرات اس نے یکساں طور پر قبول کیے تھے۔ مورخین کے مطابق اس کے ذریعے کیے گئے اقدامات نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ تھے۔ اس کی پالیسیوں نے ایسا دانشورانہ ماحول تیار کیا جس نے نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں اہم کردار ادا کیا، جیسے ہم بہ آسانی مندرجہ ذیل نکات کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔

1۔ علم خصوصاً سائنسی علوم کا فروغ

فریڈرک فلسفیوں، سائنس دانوں اور دانشوروں کا مربی تھا۔ اس نے اپنے دربار میں ان کی سرپرستی کی۔ خصوصاً البگنیائی تحریک سے وابستہ مختلف ماہرین علوم جب ظلم و جبر کا شکار ہوئے اور ان کی تحریک کی بیخ کنی کی گئی تو انہیں پناہ فریڈرک کے دربار میں ملی۔ 1224ء میں اس نے نیپلس میں یونیورسٹی قائم کی۔ اس نے عربی اور یونانی زبانوں کے مخطوطات و اہم تحریوں کا لاٹن میں ترجمہ کروایا تاکہ کلاسیکی علوم سے مغربی یوروپ بھی آشنا ہو سکے۔ خود فریڈرک نے ایک کتاب 'The Art of Hunting with Birds' لکھی، جس میں پرندوں کے شکار کی مختلف تکنیک کے علاوہ قدرتی عوامل اور پرندوں پر اپنے مشاہدے کو تحریر کیا۔

2۔ دربار کی تہذیبی و ثقافتی رنگارنگی

سسلی میں واقع فریڈرک کے دربار میں عیسائی، مسلم اور یہودی مفکرین و دانشور جمع ہو گئے، نتیجتاً معلومات کا تبادلہ ہوا اور علوم و ثقافت نے ترقی کے مراحل طے کیے۔ اس کی تہذیبی رواداری انسانیت کے اس جذبے کی عکاس ہے جو آگے چل کر نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنی۔

3۔ قانونی و انتظامی اصلاحات

اس نے حکومت میں مرکزیت پیدا کی اور سمت میں اصلاحی اقدام کیے۔ نظم و نسق میں اس کے ذریعے کی گئی تبدیلیاں دور رس نتائج کی حمل بنیں۔ علاوہ ازیں اس نے 'کانسٹیٹیوشن آف میلفی' (Constitution of Melfi) کے نام سے قوانین کا مجموعہ تیار کیا جو عقلیت اور استدلال پر مبنی تھا۔ قانون کی حکمرانی کے اصول پر اس کی بنیاد تھی اور جس نے آگے چل کر نشاۃ ثانیہ کے سیاسی افکار پر مثبت اثر ڈالا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فریڈرک دوم نشاۃ ثانیہ سے براہ راست متعلق نہ ہوتے ہوئے بھی اس میدان کی اہم شخصیت ہے۔ اس نے کلاسیکی

اور اسلامی علوم کے امتزاج کو اپنا کر نہ صرف انہیں محفوظ رکھا بلکہ مختلف علوم خصوصاً سائنس اور تہذیب و ثقافت کو فروغ دے کر نشاۃ ثانیہ کے پیش رو کا کام کیا۔ حقیقتاً وہ ایک روشن خیال آمر تھا۔

6.4.4 نشاۃ ثانیہ کا پیش رو ادیب دانتے

جن مفکرین، دانشوروں اور ادیبوں نے نشاۃ ثانیہ کی زمین تیار کی، اُن میں پہلا نام اٹلی کے مشہور فلسفی شاعر دانتے کا ہے۔ مورخین اسے آنے والے نئے دور کا مسیحا اور نشاۃ ثانیہ کا پیش رو کہتے ہیں۔ وہ شہنشاہ کا حامی اور پوپ کا مخالف تھا، چانچہ 1302ء میں اس کی سب املاک ضبط کرلی گئی اور اسے فلورنس سے نکال دیا گیا۔ اس نے 20 سال جلاوطنی میں گذارے۔ اس دوران اس نے اٹلی کے مختلف علاقوں کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اٹلی میں پھیلی لاقانونیت ختم کرنے کے لیے ایک مضبوط اور طاقتور حکمران کی ضرورت ہے۔ اس مقصد سے اس نے 1310ء میں 'ڈی مونارکیا' تصنیف کی، جس میں شہنشاہیت سے متعلق اپنے افکار و نظریات کو واضح کیا۔ اس میں دانتے نے لکھا ہے ''دنیا کی فلاح اور نجات کے لیے 'سلطنت' ناگزیر ہے'' اس نے ایک عالمگیر سیاسی نظام کی حمایت کی ہے جو پوپ کی گرفت سے آزاد ہو۔ اٹلی کی اس وقت کی سیاسی و سماجی صورتحال میں دانتے کے خیالات بہت اہم ہیں۔ اس نے قومیت کا تصور پیش کیا۔ وہ فرد کے لیے ریاست کے وجود کو لازمی قرار دیتا ہے۔ وہ ایک ایسے وفاق کا حامی تھا جس میں شہنشاہ کی حیثیت ایک انسپکٹر کی ہو۔ اس کا خیال تھا کہ عالمگیر امن کے ذریعے ہی علاقائی سکون قائم ہو سکتا ہے۔

دانتے ایک عظیم شاعر تھا۔ اس نے خوبصورت جذبات و احساسات سے پُر شاعری کی۔ اس نے فلورنس میں سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لیا اور شہر کے انتظامی عہدے پر بھی مامور ہوا۔ جلاوطنی کے دوران اس نے ایکوناس، اوروسیم، ٹالمی وغیرہ کی عظیم تخلیقات کا مطالعہ کیا۔ ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے اس نے کہا کہ اٹلی میں بادشاہ نہیں ہے دربار ہے۔ اس کی سب سے شاندار تخلیق 'ڈیوائن کامیڈی' ہے جس نے اس کی شخصیت اور افکار کو شہرت دوام بخش دی۔ اس میں انسانی روح کے سفر کی داستان بیان کی گئی، جس میں تین جہانوں سے گذرنے کو علامتی کہانی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے دوزخ جہاں انسان گناہوں کے نتائج کا سامنا کرتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ دوسرا برزخ جو توبہ، پاکیزگی اور نجات کا مرحلہ ہے۔ تیسرا جنت جو خدا کی رحمت اور نور کی علامت ہے، جہاں روح کا خدا سے ملاپ ہوتا ہے۔ یونان و روم کی قدیم تہذیب و ثقافت میں دانتے کو دلچسپی تھی۔ 'ورجل' اس کا آئیڈیل تھا۔ قدم عیسائی اور عبرانی ادب اس کی توجہ کا خاص محور تھے۔ اپنی بصیرت، دوربینی، قوت استدلال اور خود اعتمادی کے سبب وہ عہدِ وسطیٰ کے عہد سے کہیں آگے تھا۔ بعد میں اٹلی کے علاوہ دوسرے ممالک کی علاقائی زبانوں میں بھی اسی طرح کا ادب تخلیق ہوا۔ دراصل اس سے پہلے مغربی یوروپ میں یونانی و لاطینی زبانیں ہی ادبی تخلیقات کے لیے موزوں سمجھی جاتی تھیں۔ اس عہد میں یہ تاثر ختم ہوا، جس کے نتیجے میں فرانسیسی زبان میں فرالبرٹ ویلو، ریولاس وغیرہ انگریزی میں چاسر، جان کولیٹ وغیرہ اسپینی میں سروینیئر اور پرتگالی میں کومونز جیسے ادباء و شعراء کی تخلیقات نئے دور کی آمد کی نوید دے رہی تھی۔ ان تحریروں میں نشاۃ ثانیہ کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔

6.5 عیسائی مذہب اور کلیسا

نشاۃ ثانیہ کے آغاز اور اس کے وجود کو جنم دینے میں عیسائیت اور کلیسا کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یوروپی تہذیب میں عیسائی مذہب کو بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ گریگوری اعظم سے لے کر دانتے تک کی یوروپی ثقافت اور تمدن و معاشرت عیسائیت کے زیر اثر تھی۔ گریگوری کے عہد سے ہی کلیسا کو تربیت یافتہ پڑھے لکھے افراد کی ضرورت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ دنیا کے ہر حصے سے تعلیم یافتہ پادریوں کو روم آنے کے لیے ترغیب دی جاتی رہی تھی۔ اٹلی میں مونٹے کیسینو مذہبی ادبیات کے مطالعہ کا اہم مرکز بن کر اُبھرا۔ پوپ سلولیٹر دوم' یوروپ میں عربی علوم کی اشاعت سے قبل سائنس کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ 11 ویں صدی کے اول ربع میں اس کے شاگرد فلرٹ نے لاطینی ادب کے کلاسیکی سرمایہ کے تحفظ اور تجدید کا کام کیا۔ اس کی ادبی و مذہبی تحریروں نے بعد کے عہدِ وسطیٰ کے دانشوروں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ٹورس کے بیرنگر (Barengar of Tours)(999-1088) عہدِ وسطیٰ کے مفکرین میں شاید پہلا شخص تھا جس نے کلیسا کے اصول و قوانین کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کو اور اس بات پر زور دیا کہ بنا کسی استدلال کے انہیں قبول نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ان کے خلاف نہیں تھا۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ سارا نظام اور اس کے ضابطے عقل کے عین مطابق ہیں۔ اس نے معروضی انداز میں مقدس کتب کی تفاسیر کو اہمیت دی۔ خود اس کی تحریر میں اسی خصوصیت کی حامل تھیں۔ سینٹ اینسلم (Saint Anselm 1033-1109) ایک دیگر مذہبی مفکر کو (Father of Scholartism) کہا جاتا ہے۔ اس نے خدا کے وجود کے لیے عقلی دلائل دیئے۔ الٰہیات کو عقل کے ساتھ مربوط کیا۔ اس کا مشہور قول ہے ''میں اس لیے نہیں سمجھنا چاہتا کہ ایمان لاؤں بلکہ میں ایمان لاتا ہوں تاکہ سمجھ سکوں''، تھامس ایکواسنس جیسے بڑے مفکر نے بھی اس سے متاثر ہو کر کام کیا۔ فرانس کے پیٹر ابیلارڈ (Peter Abelard)(1079-1142) کا شمار عہد وسطیٰ کے وسطی کے سب سے روشن خیال مفکرین میں ہوتا ہے۔ اس نے بھی عقل کی بنیاد پر مذہبی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اسی عہد میں مغربی دانشوران کا تعارف عربی زبان میں موجود فلسفہ' ریاضی اور سائنس کے علوم سے ہو رہا تھا۔ یونان و عرب اور بازنطائن کے علوم کی آمیزش سے یوروپ کے علمی میدان کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ آکسفورڈ اور پیرس وغیرہ میں یونیورسٹیز کا قیام عمل میں آیا۔ تیرہویں صدی سے قبل تک ارسطو کے فلسفہ اور اس کے قائم کردہ مختلف اصول ہی مرکزیت کے حامل تھے، لیکن راجر بیکن (Roger Bacon, 1214-1292) نے اس کی نفی کی۔ اس نے زور دیا کہ علم کا اصل ذریعہ تجربہ ہے۔ اس نے مشاہدہ کو اہمیت دی۔ وہ ایک سائنس داں بھی تھا۔ اس کے نظریات نے بعد میں عینک کی ایجاد میں مدد کی۔ اس نے کیمیا اور نجوم پر بھی تحقیق کی لیکن مذہبی حدود کے اندر رہ کر۔ وہ عقلیت' تجربہ اور تحقیق کو علم کا ذریعہ قرار دینے والے ابتدائی مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے دور کو جاہلیت کا عہد قرار دیا اور کہا کہ یوروپ کے عالم ارسطو کے بھدّے تراجم سے جہالت کو فروغ دے رہے ہیں۔

لگ بھگ اسی دور میں Humanism یا انسان دوستی کے اصول کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے تحت انسان کی قدر و قیمت اور اخلاقی قدروں پر زور دیا گیا۔ فرد کی بہتری اور تعلیم کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ اس فلسفہ کے علمبرداروں میں فرانسسکو' ایراسمس' ٹامس مور (Francisco, Erasmus, Thomas More) وغیرہ مفکرین کو اہمیت حاصل ہے۔ ایراسمس کو Prince of

Humanists کہا جاتا ہے۔ اس نے مسیحیت کو عقل، تعلیم اور اخلاقیات کے ذریعے سمجھنے پر زور دیا۔ بائبل کا یونانی نسخہ مرتب کیا اور اسے لاطینی میں ترجمہ کیا تاکہ عام لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اپنی مشہور تصنیف *In Praise of Folly* میں اس نے کلیسا کی بدعنوانیوں کو نشانہ بنایا۔ اس نظام کی خرابیوں پر زبردست طنز و تنقید کی۔ تھامس مور نے انصاف، مساوات اور مذہبی رواداری پر زور دیا۔ اسی طرح اطالوی شاعر اور دانشور فرانسسکو پیٹریاک، انسانی فطرت، اخلاقیات اور اندرونی روحانیت پر اپنے یقین اور ان افکار کی وکالت کے لیے جانا جاتا ہے۔ ان مفکرین نے نہ صرف اپنے عہد میں لوگوں کو متاثر کیا بلکہ بعد کے دانشران پر بھی اثرات مرتب کیے۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ میں ان کا کردار بھی کم اہم نہیں ہے۔

6.6 معاشی و معاشرتی عناصر

نشاۃ ثانیہ کے آغاز سے قبل کے عہد میں صنعتی و تجارتی ترقی واضح طور پر دکھائی دینے لگی تھی، جس کے نتیجے میں یوروپ کے نقشہ پر شہر نمودار ہونے لگے۔ چنانچہ جاگیرداروں اور پادریوں کی مانند صنعت کاروں اور تاجروں کا ایک طبقہ وجود میں آگیا۔ اپنی معاشی مضبوطی کے سبب یہ نیا طبقہ بھی جاگیرداروں اور پادریوں کی طرح علوم و فنون اور ادب کا سرپرست بن گیا۔ یہی نہیں پیشہ ورانہ صنعتوں کی ترقی نے ایک نئے طرزِ حیات کی بنیاد ڈالی، یعنی شہری زندگی۔ اُس وقت بھی آج ہی کی طرح دیہی زندگی کے مقابلے میں شہری زندگی زیادہ پُرکشش تھی۔ اس تبدیلی نے صرف طرزِ حیات پر ہی نہیں بلکہ سوچ و فکر پر بھی اپنا اثر ڈال۔ اب لوگ پرانے دقیانسی رسم و رواج کو آنکھ بند کرکے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور ان کی قبولیت کا انحصار عقل و دلیل بننے لگے۔

معاشی ترقی اور نئے تجارتی روابط کے دو اہم نتائج برآمد ہوئے۔ پہلا تاجروں کے ذریعے خیالات و افکار کا تبادلہ بڑے پیمانے پر ہوا، جس سے مغربی یوروپ کی دانشورانہ استعداد میں اضافہ ہوا۔ دوسرا یوروپ خصوصاً اٹلی کے شہروں میں (جو تجارت کے بڑے مراکز تھے) ایک ایسا خوشحال متوسط طبقہ وجود میں آیا جو علم و ادب کے حصول میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے مختلف ماہرین علم و فن کی سرپرستی خصوصاً وہ علماء و مفکرین جو بغداد، قاہرہ اور قرطبہ وغیرہ کے مشہور علم کے مراکز سے کسبِ فیض کر چکے تھے۔ انہوں نے ہی مغربی یوروپ میں علم و دانش کی نئی فضا تار کی، جو فکر کی آزادی اور علوم کی ترقی کا باعث بنی۔ اس طرح شہروں کا یہ مالدار کاروباری طبقہ، تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا طاقتور سرپرست بن گیا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے شہر خصوصاً اٹلی کے تجارتی شہروں کے اس دانشورانہ ماحول اور سرگرمیوں کا عظیم نشاۃ ثانیہ سے گہرا تعلق ہے۔ علاوہ ازیں جنوبی اٹلی اور سسلی پر نارمنوں کا قبضہ، یونانی، لاطینی، مسلم اور عیسائی تہذیبوں کے امتزاج کا سبب بنا۔ اسی طرح گیارہویں صدی میں اسپین کے مسلمانوں کے خلاف عیسائیں کی سیاسی کامیابیوں نے مغربی یوروپ میں عرب فلسفہ، سائنس، ادب اور فنون لطیفہ کی ترویج و اشاعت کا راستہ کھولا۔

6.7 نشاۃ ثانیہ اور صلیبی جنگیں

یروشلم (فلسطین) کا علاقہ مسلم، عیسائی اور یہودی تینوں مذاہب کے پیروکاروں کے لیے یکساں طور پر تقدس کا درجہ رکھتا ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں تینوں ہی قوموں کا یہاں تسلط رہا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد عرب کے مسلمانوں نے جو فتوحات حاصل کیں، اس کے نتیجے میں خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مذکورہ سرزمین مسلمانوں کو حاصل ہوگئی۔ اسے مسلمانوں سے واپس لینے اور کچھ دیگر وجوہات کے سبب گیارہویں صدی کی آخری دہائی سے لے کر تیرہویں صدی کے اواخر تک عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو تصادم ہوا اُن جنگوں کو تاریخ میں صلیبی جنگیں (Crusade) کہا جاتا ہے (تفصیل ہم 5ویں اکائی میں پڑھ چکے)۔ ان جنگوں نے صرف سیاسی صورتحال کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

تقریباً دو صدیوں تک جاری اس تصادم کا نشاۃ ثانیہ کے عمل پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔ اس دورانیہ میں مشرقی و مغربی تہذیب و ثقافت ایک دوسرے کے بہت قریب آئیں۔ عرب کے سیاسی عروج نے انہیں یونان و ہند کے علوم و فنون سے متعارف کیا، جس سے استفادہ کر کے انہوں نے علمی دنیا میں بے مثال ترقی کی۔ مشرق میں بغداد اور مغرب میں قرطبہ جیسے بڑے علمی مراکز وجود میں آئے۔ صلیبی جنگ کے سبب یوروپ کا عرب سے جو اختلاط ہوا، اس کے نتیجے میں عربوں کے علوم اہل یوروپ تک پہنچے۔ ارسطو کی سائنسی تصانیف، ریاضی، الجبرا، علم نجوم وغیرہ سے یوروپ کی واقفیت کا سہرا انہی صلیبی جنگوں اور عرب کے مسلمانوں کے سر ہے۔ کاغذ بھی یوروپ تک عرب کے ذریعے ہی پہنچا۔ ایشیاء، یوروپ اور آفریقہ تین براعظموں پر مشتمل مسلمانوں کی عظیم سلطنت نے مختلف سائنسی علوم اور تہذیب و ادب کے میدان میں جو برتری حاصل کی تھی، اس سے یوروپ کو متعارف کرانے میں ان صلیبی جنگوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عہدِ وسطیٰ میں عموماً عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ دنیا و آخرت کی تمام ضرورتوں کے پورے ہونے کا انحصار کلیسا اور مسیحیت پر ہے، لیکن ایک تہذیب سے رابطے میں آنے کے بعد ان کے افکار میں تبدیلی آئی۔ لوگوں کے دل و دماغ پر کلیسا اور مذہبی طبقے کے جو اثر تھا وہ کم ہوا۔ پرانے خیالات و عقائد کمزور ہونے اور نئے افکار پیدا ہونے کے سبب نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی۔ صلیبی جنگوں نے یوروپی اقوام کے جغرافیائی نظریات اور معلومات میں زبردست تبدیلی پیدا کی۔ وہ نئے راستوں سے واقف ہوئے، جس کے بعد کئی باہمت مہم جو افراد نے مشرقی ممالک کے سفر کیے اور نئے راستے اور نئے ممالک کی دریافت ہوئی۔ صلیبی جنگوں نے مشرق و مغرب کو جو اختلاط کا موقع فراہم کی، اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے بعد میں نشاۃ ثانیہ کے عمل میں اہم کردار ادا کیا۔

مشرق و مغرب کو قریب لانے اور ثقافتی تبادلے میں کچھ دیگر عوامل بھی پیش پیش رہے۔ مثلاً تیرہویں صدی میں مشہور فاتح چنگیز خان نے ایک عظیم منگول سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس کو مزید طاقت اور وسعت اس کے جانشین قبلائی خاں کے دور میں حاصل ہوئی۔ قبلائی خان کی سلطنت میں روس، پولینڈ اور ہنگری کے علاقے شامل تھے۔ اس نے دربار میں ہمیشہ مختلف ممالک کے معروف ماہرین علوم و فنون، مذہبی مبلغین اور تاجروں کا جمگھٹ رہتا۔ اس دور میں پیکنگ (بی جنگ) اور سمرقند تمدن و ثقافت کا ایسا مرکز بن گئے تھے، جس میں دنیا کی بیشتر تہذیبوں کے رنگوں کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ مورخین کے مطابق مشرق و مغرب کا بہترین سنگم اسی عہد میں نظر آتا ہے۔ دونوں تہذیبوں کا رابطہ مضبوط ہوا۔ دانشوروں کے باہمی تبادلہ خیال اور مباحث نے فکر و خیال کے نئے دروازے کھولے، جس کا براہ راست فائدہ عوام الناس کو پہنچا۔ وینس کا مشہور سیاح مارکوپولو 1272ء میں قبلائی خان کے دربار میں گیا۔ واپس لوٹ کر اس نے اپنا سفر نامہ لکھا، جس میں تفصیلی حالات

درج کیے۔اس نے بھی یوروپی عوام پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ کاغذ جیسا کہ ہم جانتے ہیں چین میں ایجاد ہوا، جہاں سے یہ عربوں کے ذریعے اسپین کے راستے سے یوروپ پہنچا۔ ہر پرنٹنگ پریس اور کاغذ کے استعمال نے علم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بہت تیزی سے نئے خیالات و نظریات سے واقفیت کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ کتابیں چھپنے لگیں، جن کی محنت ہاتھ سے لکھی کتابوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی تھی، نہ صرف تعلیم کے میدان میں ترقی ہوئی بلکہ علاقائی زبنوں کے ادب میں بھی تخلیقات منظر عام پر آنے لگیں۔ حقیقتاً عہدِ وسطیٰ کے آخری حصے میں رونما ہونے والی ان تبدیلیں نے علم و دانش کی خبریں مضبوط کرنے اور بین الاقوامی سماج کی آراء کو متاثر کرنے کا کام کیا، جس کا حقیقی فیض اہلِ یوروپ نے اٹھایا۔

6.8 نشاۃ ثانیہ اور اٹلی

اس باب کے گذشتہ اوراق میں ہم نے یہ جائزہ لیا کہ نشاۃ ثانیہ سے قبل دنیا خصوصاً یوروپ میں کس طرح کے واقعات رونما ہو رہے تھے اور کیا تبدیلیاں وقوع پذیر تھیں۔ ہم نے یہ بھی پڑھا کہا کہ ان واقعات اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں یوروپ پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ نشاۃ ثانیہ سے کافی پہلے یوروپ اُس صورتحال سے گذرا جس نے بالآخر نئے عہد کو جنم دیا۔ کوئی بھی انقلاب چاہے وہ افکار و نظریات کا ہو اس کا عملی مشاہدہ دیکھنے کو ملے، یکایک نہیں ہو جاتا۔ اس کی پیدائش سے بہت عرصہ قبل اس کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سماج میں اس کی آہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کو جدید یوروپ کا غماز سمجھا جاتا ہے، لیکن عہد وسطیٰ کے یوروپ میں اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ مغربی یوروپ کے مختلف حصوں میں ہونے والی دانشورانہ تحریکوں اور افکار و نظریات کی تبدیلیوں کو ہم پڑھ چکے ہیں جو نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ بنیں۔ لیکن واقعتاً نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی سے ہوا، جس طرح مذہبی اصلاحی تحریک جرمنی سے شروع ہوئی تھی۔ اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے پس پردہ کیا اسباب تھے، ان کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔

مغربی یوروپ کی مجموعی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد بہ آسانی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آخر کیوں نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی سے ہوا۔ وہ اسباب جنہوں نے اٹلی کے لیے سازگار فضا تیار کی۔ ہم مندرجہ ذیل نکات کے تحت سمجھ سکتے ہیں۔

1۔ **اٹلی کی جغرافیائی اہمیت اور تجارتی ترقی:** اٹلی بحیرہ روم کے وسط میں واقع ہے، جس کے سبب یہاں تجارت کے زیادہ اور آسان مواقع فراہم تھے۔ چنانچہ صنعت و تجارت کی ترقی کے سبب بڑے بڑے پُر امن شہر نمودار ہوئے۔ ان شہروں میں ایسا آسودہ حال و مالدار طبقہ وجود میں آیا، جس نے مختلف ماہرین علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ مورخین کے مطابق اٹلی کے یہ شہر سیاسی، علمی و فنی سطح پر قدیم یونان کے شہروں کی یاد دلاتے ہیں۔ 'فلورنس' کو اٹلی کا 'ایتھنس' کہا گیا۔ وہاں کے عوام عمومی طور پر فکری بلندی کے حامل تھے۔ اٹلی کے مذکورہ شہر یوروپ میں سب سے پہلے عہد وسطیٰ کے حصار کو توڑ کر جدید دور کی طرف گامزن ہوئے۔ عہدِ وسطیٰ کے ان ہی شہروں کو نشاۃ ثانیہ کی اولین پرورش کا فخر حاصل ہے۔

2۔ **مختلف ذاتوں اور اقوام کی آماجگاہ:** اٹلی کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ یہاں کا سماج مختلف ذاتوں اور اقوام کی آمیزش پر مشتمل تھا۔ گاتھ،

لومبارڈ، فرینک، نارمن، جرمن اور عرب باشندوں کے ملاپ نے فکر کے نئے دروازے کھولے۔ رومی، بازنطینی اور عرب تہذیبوں کے آپسی رابطے نے روشن خیالی اور ذہنی حریت کو جلا بخشی، جس کے نتیجے میں ایک وسیع المشرب سماج وجود میں آیا، جو دانشورانہ تحریکوں کے لیے بہت موزوں تھا۔

3۔ **اٹلی کے تعلیمی اداروں کی مذہبی رواداری:** عموماً اس وقت یوروپ کی تعلیم گاہوں میں مذہبی تعلیم کو ہی بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اٹلی میں رومی قوانین اور طب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ درسگاہیں سیکولر خصوصیت کی حامل تھیں جس نے علم کی نئی جہتیں روشن کیں
۔

4۔ **قدیم روم سے گہرا تعلق:** اٹلی کے باشندے یوروپ کے دیگر ممالک کے مقابلے روم کی قدیم تہذیب سے زیادہ مضبوط رشتہ کے حامل تھے۔ زبان و نسل کے اعتبار سے قدیم روم سے ان کا تعلق زیادہ تھا۔ وہ اسے قابل فخر سمجھتے تھے اور اس ثقافت کے احیاء میں بھی انہیں دلچسپی تھی۔ قدیم یوروپ کی یادگاریں ان کے ارد گرد بکھری تھیں۔ قدیم عمارتوں کے کھنڈر ہر طرف دکھائی دیتے جو ان کے اندر برتری کا احساس پیدا کرتے۔ گذشتہ تہذیب کی عظمت ان کے دماغوں پر نقش تھی۔ ان کے مصنفین عظمت رفتہ کے گیت گاتے نظر آتے ہیں۔ اٹلی کے عوام کی نفسیات پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

5۔ **سیاسی و سماجی صورتحال:** اٹلی کی سیاسی و سماجی صورتحال نشاۃ ثانیہ کے آغاز اور نمو کے لیے سازگار ثابت ہوئی۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح سماج کے مالدار تاجر طبقے سے علم و ادب کی سرپرستی کی۔ سیاسی طور پر بھی سکون و اطمینان کی موزوں فضا میں اہلِ علم اور ماہرین فن کے لیے کام کرنا بہت سہل تھا۔ مختلف حکمراں طبقوں نے ادب اور آرٹ کے لیے کام کرنے والوں کو رسائل فراہم کیے۔

مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے آخری حصے اور دورِ جدید کے آغاز میں اٹلی کی سیاسی، سماجی، معاشی اور علمی صورتحال نشاۃ ثانیہ کے وقوع کے لیے موزوں و مناسب تھی۔ مذکورہ بالا اسباب کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضے کے بعد وہاں کے بہت سے عیسائی علماء، ادباء اور اہلِ علم اٹلی کے مختلف شہروں میں جا گزیں ہوئے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ لگتا تھا یونان کا زوال نہیں ہوا ہے، اس کی اٹلی میں جسے قدیم عہد کا ''میگنا گریشیا'' کہا جاتا تھا، دوبارہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اہلِ علم اپنے ساتھ بہت سے پرانے یونانی مخطوطات اپنے ساتھ لائے تھے، جن سے اہلِ یوروپ پہلے ناواقف تھے۔ یہ افراد اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس سے منسلک ہوئے اور اٹلی کے افکار و نظریات کو نئی سمت دی۔

6.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

14ویں صدی سے 16ویں صدی کے درمیان یوروپ میں افکار و نظریات، تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون میں بہت سی مثبت تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کے نتیجے ایک نئے در کا آغاز ہوا۔ تاریخ میں یہ عمل نشاۃ ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تبدیلیاں کسی اچانک واقعہ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ دھیرے دھیرے کئی صدیوں نے اسے انجام دیا۔ نشاۃ ثانیہ کی ابتداء 14ویں صدی سے مانی جاتی ہے لیکن اسے سکئی صدیاں

پیشتر یوروپ کی سرزمین اس کے لیے سازگار ہونا شروع ہو گئیت ھی۔ بہت سے ایسے واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، جنہوں نے بتدریج نشاۃ ثانیہ کی زمین تیار کی اور اس کا پیش خیمہ بنے، جن میں کیرولنجیائی (Carolingian) تحریک میں اس کا بتدائی شواہد نظر آتے ہیں۔ چارلس اعظم کے دور اور اس کی سرپرستی میں یوروپ کے کچھ حصوں میں قدیم علوم وفنون کی بازیابی' لاطینی زبان کا تحفظ اور نئے نظریات کی تشکیل کا عمل انجام پایا۔ لیکن یہ سلسلہ بہت دیر پا نہیں تھا۔اس کے بعد 12ویں اور 13ویں صدی میں جنوبی فرانس میں چلنے والی البگنیائی (Alliggensian) تحریک گو کہ مذہبی تھی لیکن اس نے قدیم رسومات کے خلاف جو آواز اٹھائی اور جس طرح دو دہائیوں تک چرچ کی بدعنوانی کو نشانہ بنایا۔ اس نے بعد کے دور میں ہونے والی مذہبی اصلاحی تحریکوں کو متاثر کیا۔ اسی طرح فریڈرک دوم جو ایک روشن خیال اور عقلیت پسند حکمراں تھا اس نے تیرہویں صدی کے نصف اول میں اپنی پالیسیوں سے وہ ماحول بنایا جو بعد میں نشاۃ ثانیہ کا پیش خیمہ بنا۔

نشاۃ ثانیہ کے عمل میں بہت سے ادباء وشعراء نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مثلاً اٹلی کے عظیم شاعر دانتے نے اپنی تخلیقات کے ذریعے رائج الوقت افکار و نظریات کو نئی سمت دی۔ عہدِ وسطیٰ میں کلیسا اور پادری طبقے کی سرپرستی میں مختلف علوم وفنون کی ترقی ہوئی۔ مثلاً اٹلی میں مونٹے کیسینو مذہبی ادب کی تعلیم کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس ضمن میں سینٹ اینسلم (Saint Anselm) اور راجر بین (Roger Bacon) وغیرہ مفکرین نے اہم خدمات انجام دیں۔ گیارہویں صدی کے آخر سے 13ویں صدے کے آخر تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جانے والے صلیبی جنگوں نے بھی نشاۃ ثانیہ کو وجود میں لانے کے لیے بہت کام کیا۔ مشرق و مغرب کا اختلاط عمل میں آیا اور مسلمانوں کے ذریعے نئے نہ صرف عرب بلکہ قدیم یونانی علوم بھی یوروپ تک پہنچے۔ جغرافیائی معلومات میں اضافہ ہوا اور نئے علاقے دریافت ہوئے، جنہوں نے فکر و عمل میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ معاشی سرگرمیاں انسانی زندگی اور سماج کے لیے بنیادی عوامل میں سے ایک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ سے قبل صنعتی و تجارتی ترقی کی رفتار بہتر ہو گئی تھی۔ معاشی طور پر مضبوط افراد خصوصاً تاجروں نے علوم وفنون کی آبیاری کا کام انجام دیا۔ بڑے شہر وجود میں آئے، جس میں مالدار طبقے نے علماء وادباء کی سرپرستی کی۔ سولہویں صدی تک پورا یوروپ نشاۃ ثانیہ کے عمل سے گذر چکا تھا، لیکن اس کا آغاز اٹلی سے ہو۔ اٹلی اپنی جغرافیائی اہمیت اور سیاسی و سماجی صورتحال کی بنا پر اس تبدیلی سے گذرنے کے لیے سب سے پہلے تیار تھا۔ قدیم رومی تہذیب و ثقافت اور علوم سے اس کا گہرا تعلق تھا اور یہاں کے تعلیمی اداروں پر مذہب کا اثر بھی نہایت ہی کم تھا، جس کی وجہ سے نئے خیالات کی رَو نے اس سرزمین پر اولین گرفت بنائی۔

6.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

کیرولنجیائی	:	آٹھویں صدی کے آخر میں وسطی یوروپ میں قائم ہونے والی حکومت۔
البگنیائی تحریک	:	جنوبی فرانس کی مذہبی تحریک جس نے اصلاح کے دروازے کھولے۔
کانسٹی ٹیوشن آف میلفی	:	فریڈرک دوم کا تیارہ کردہ قانون کا مجموعہ۔
ڈی مونارکیا	:	سیاسی نظریات پر مبنی دانتے کی تخلیق۔

انسان دوستی(Humanism): ایک ایسا فکری رجحان جس میں تعلیم، فرد کی قدر اور دنیوی زندگی پر زور دیا گیا۔

پرنس آف ہیونیسٹس : مفکر ایراسمس

یروشلم (فلسطین) : مغربی ایشیاء کا وہ علاقہ جو مسلموں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے یکساں طور پر مقدس ہے۔

صلیبی جنگیں(Crusade): گیارہویں سے تیرہویں صدی میں عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگیں۔

نشاۃ ثانیہ : یوروپ میں ہونے والی نظریات وافکار کی وہ تبدیلیاں، جنہوں نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

کیتھرازم(Catharism): البگنیائی تحریک کو ہی کیتھرازم کہا جاتا ہے۔

6.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. شہنشاہ چارلس اعظم (Charlemagne) کا تعلق کس سلطنت سے تھا؟

(الف) بازنطینی سلطنت (ب) فرینک سلطنت (ج) عثمانی سلطنت (د) سلجوقی سلطنت

2. فلسفیوں، سائنسدانوں اور دانشوروں کا ولی تھا" یہ قول کس حکمراں کے بارے میں کہا گیا؟

(الف) شارلیمان (ب) اوٹو اول (ج) فریڈرک دوم (د) ہنری چہارم

3. فریڈرک دوم کا دربار کہاں واقع تھا؟

(الف) روم (ب) پیرس (ج) پالرمو(سسلی) (د) لندن

4. کانسٹی ٹیوشن آف میلفی (Constitution of Melfi) "کس کی تخلیق ہے؟

(الف) شارلیمان (ب) جسٹینین (ج) فریڈرک دوم (د) اوٹو اول

5. ڈی مونارکیا (De Monarchia) "کے خالق کون ہیں؟

(الف) تھامس ایکویناس (ب) پیٹرابیلارڈ (ج) دانتے الیگیری (د) پیٹرارک

6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. البگنیائی تحریک کہاں شروع ہوئی اور نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں اس کا کیا کردار رہا؟
2. ''دانتے''نشاۃ ثانیہ کا پیش رو ادیب تھا''وضاحت کیجیے۔
3. صلیبی جنگوں اور نشاۃ ثانیہ کے مابین تعلق پر روشنی ڈالیے۔

6.113 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. نشاۃ ثانیہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟اس صورتحال پر تفصیلی روشنی ڈالیے جو اس کا پیش خیمہ بنی۔

2. یوروپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی سے ہوا، اس کے اسباب و علل کو تفصیل سے بیان کیجیے۔

جوابات

1۔(ب)فرینک سلطنت 2۔(ج)فریڈرک دوم 3۔(ج)پالرمو(سسلی) 4۔(ج)فریڈرک دوم
5۔(ج)دانتے الیگیری

Suggested Learning Resources

1. Andorson, Perry, *Passage from Antiquity to Feudalism*, London, 1974.
2. Asbridge, Thomas, *The Crusades: The Authoritative History of the War for the Holy Land*, Ecco, 2012.
3. Bede, *Ecclesiastical History of the English People*, (trans. Leo Sherley-Price), Penguin Classics, 1990.
4. Bloch, Marc, *Feudal Society*, 2 Vols., Chicago, 1961.
5. _____, Marc, *Feudal Society*, (trans. L.A. Manyon), Routledge, 1961.
6. Brooke, Christopher, *The Medieval Church, 1000–1300*, Routledge, 1974.
7. Bull, Marcus, *Thinking Medieval: An Introduction to the Study of the Middle Ages*, Palgrave Macmillan, 2005.
8. Burckhardt, Jacob, *The Civilization of the Renaissance in Italy*, (trans. S.G.C. Middlemore), Penguin Classics, 1990.
9. Burke, Peter, *The Italian Renaissance: Culture and Society in Italy*, Princeton University Press, 2014.
10. Cameron, Euan, *The European Reformation*, Oxford University Press, 2012.
11. Cantor, Norman F., *The Civilization of the Middle Ages*, Harper Perennial, 1994.
12. _____, Norman F., *The Civilization of the Middle Ages*, HarperCollins, 1993.
13. Carroll, Warren H., *The Building of Christendom*, Christendom Press, 1987.
14. Dev, Arjun, *The Story of Civilisation, Vol-I*, NCERT, New Delhi.
15. Dobb, Maurice, *Studies in Development of Capitalism*, New York, 2006.
16. Durant, Will, *The Age of Faith*, Simon & Schuster, 1950.
17. Ganshof, F.L., *Feudalism*, New York, 1964.
18. Garin, Eugenio, *Italian Humanism: Philosophy and Civic Life in the Renaissance*, (trans. Peter Munz), Basil Blackwell, 1965.
19. Gregory of Tours, *The History of the Franks*, (trans. Lewis Thorpe), Penguin Classics, 1974.
20. Hale, John, *The Civilization of Europe in the Renaissance*, Atheneum, 1994.
21. Haywa, C.T.H., *Political and Cultural History of Modern Europe Vo.2*, London, 1970.
22. Heather, Peter, *The Fall of the Roman Empire: A New History of Rome and the Barbarians*, Oxford University Press, 2006.
23. Herrin, Judith, *The Formation of Christendom*, Princeton University Press, 1987.
24. Hilori, Rodney ed., *The Transition from Feudalism to Capitalism*, New York, 2001.
25. Hodgett, Gerald A.J., *A Social and Economic History of Medieval Europe*, 2010.
26. Holmes, George ed., *The Oxford Illustrated History of Medieval Europe*, Oxford University Press, 2001.
27. Housley, Norman, *The Crusades: A History*, Yale University Press, 2006.
28. Hussain, Mahmood, *Tareekh-e-Europe (Quroon-e-Wusta)*, Urdu Book Stall.
29. Kristeller, Paul Oskar, *Renaissance Thought and Its Sources*, (ed. Michael Mooney), Columbia University Press, 1979.
30. Le Goff, Jacques, *Medieval Civilization 400-1500*, (trans. Julia Barrow), Blackwell, 1988.
31. Madden, Thomas F., *The New Concise History of the Crusades*, 3rd ed., Rowman & Littlefield, 2014.
32. Martines, Lauro, *Power and Imagination: City-States in Renaissance Italy*, Johns Hopkins University Press, 1988.
33. McFarlane, K.B., *The Nobility of Later Medieval England*, Oxford University Press, 1973.
34. McKitterick, Rosamond, *The Carolingians and the Written Word*, Cambridge University Press, 1989.

35. Najemy, John M., *A History of Florence, 1200–1575*, Blackwell Publishing, 2006.
36. Nauert, Charles G., *Humanism and the Culture of Renaissance Europe*, 2nd ed., Cambridge University Press, 2006.
37. Phillips, Jonathan, *Holy Warriors: A Modern History of the Crusades*, Random House, 2009.
38. Pirenne, Henri, *Economic and Social History of Medieval Europe*, Harcourt, Brace and Company, 1937.
39. _____, Henri, *Economic and social History of Medieval Europe*, London, 2010.
40. _____, Henri, *Medieval Cities: Their Origins and the Revival of Trade*, Princeton, 1969.
41. Plumb, J.H., *The Italian Renaissance*, Mariner Books, 2001.
42. Postan, M.M., *The Medieval Economy and Society: An Economic History of Britain 1100-1500*, Weidenfeld and Nicolson, 1972.
43. Reynolds, Susan, *Kingdoms and Communities in Western Europe, 900–1300*, Oxford University Press, 1997.
44. Riley-Smith, Jonathan ed., *The Oxford Illustrated History of the Crusades*, Oxford University Press, 1995.
45. _____, Jonathan, *The Crusades: A History*, 3rd ed., Bloomsbury Academic, 2014.
46. Rubin, Miri, *The Middle Ages: A Very Short Introduction*, Oxford University Press, 2014.
47. Ruggiero, Guido, *The Renaissance in Italy: A Social and Cultural History of the Rinascimento*, Cambridge University Press, 2015.
48. Saint Benedict, *The Rule of Saint Benedict*, (trans. Carolinne White), Penguin Classics, 2008.
49. Southern, R.W., *Western Society and the Church in the Middle Ages*, Penguin Books, 1970.
50. Strayer, Joseph R., *On the Medieval Origins of the Modern State*, Princeton University Press, 1970.
51. Tierney, Brian, *The Crisis of Church and State, 1050–1300*, University of Toronto Press, 1988.
52. Tuchman, Barbara W., *A Distant Mirror: The Calamitous 14th Century*, Knopf, 1978.
53. Tyerman, Christopher, *God's War: A New History of the Crusades*, Belknap Press of Harvard University Press, 2006.
54. _____, Christopher, *The Crusades: A Very Short Introduction*, Oxford University Press, 2005.
55. Ward-Perkins, Bryan, *The Fall of Rome and the End of Civilization*, Oxford University Press, 2005.
56. Wickham, Chris, *Framing the Early Middle Ages: Europe and the Mediterranean, 400–800*, Oxford University Press, 2005.
57. _____, Chris, *Medieval Europe*, Yale University Press, 2016.
58. _____, Chris, *The Inheritance of Rome: Illuminating the Dark Ages, 400–1000*, Penguin Books, 2010.
59. William of Tyre, *A History of Deeds Done Beyond the Sea*, (trans. Emily Atwater Babcock and August C. Krey), Columbia University Press, 1943.
60. Ziegler, Philip, *The Black Death*, Collins, 1969.

اردو کتب

61. حسین، ڈاکٹر محمود، تاریخِ یورپ (عہد وسطیٰ)، اردو بک اسٹال، لاہور۔

نمونہ پرچہ امتحان

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

بی۔اے۔(آنرس) تاریخ، تیسرا سمسٹر

عہد وسطیٰ کا یورپ

DSE III, Medieval Europe

Paper Code: BNHS301DET

وقت: تین گھنٹے Time: 3 hours　　نشانات :Marks 70

ہدایات:

یہ پرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1. حصہ اول کے تمام سوالات لازمی ہیں۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)
2. حصہ دوم میں 08 سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔(5x6=30 Marks)
3. حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ طالب علم کو کوئی 03 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال: 1

i۔ مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ کس سال میں ہوا؟

(الف)395ء　(ب)410ء　(ج)476ء　(د)1453ء

ii۔ جاگیردارانہ نظام میں زمین حاصل کرنے والے ماتحت شخص کو کیا کہا جاتا تھا؟

(الف)سرف　(ب)واسل　(ج)برگر　(د)نائٹ

iii۔ پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان مشہور 'کینوسا کا واقعہ' کس سال پیش آیا؟

(الف)1077ء　(ب)1095ء　(ج)1122ء　(د)1309ء

iv۔ چودھویں صدی میں پھیلنے والی کس ہولناک وبا نے یورپ کی ایک بڑی آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟

(الف)قحطِ عظیم　(ب)طاعونِ عظیم　(ج)ٹائیفائیڈ　(د)ملیریا

v۔ کس فرانسیسی شہر میں پوپ اربن دوم نے 1095ء میں عیسائیوں سے مسلمانوں کے خلاف پہلی صلیبی جنگ کی اپیل کی تھی؟

(الف)پیرس　(ب)ایویگنون　(ج)کلرمونٹ　(د)مارسیلز

حصہ دوم

2. مغربی رومی سلطنت کے زوال میں بربر اقوام (گاتھ، ونڈال وغیرہ) کے حملوں کے کردار کو مختصراً بیان کریں۔
3. عہد وسطیٰ کے یورپ میں جاگیردارانہ نظام کی بنیادی سماجی ساخت (امراء، پادری اور کسان) کی مختصر وضاحت کریں۔
4. گیارہویں صدی میں رائج ہونے والا 'تین کھیتوں کا نظام' (Three-Field System) کیا تھا اور اس نے زراعت پر کیا اثرات مرتب کیے؟
5. عہد وسطیٰ کے شہری مراکز میں دستکاروں اور تاجروں کے 'گلڈ سسٹم' (Guild System) کی معاشی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔
6. صلیبی جنگوں کے پسِ پشت کارفرما سیاسی اور معاشی اسباب کو مختصراً تحریر کریں۔
7. یورپ میں ریاست اور کلیسا کے درمیان 'تعیناتی کا تنازع' (Investiture Controversy) کیا تھا؟
8. نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے پیش رو ادیب 'دانتے' کی ادبی خدمات اور ان کے نظریات کو بیان کریں۔
9. پورے یورپ کے مقابلے میں اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے چند اہم اسباب مختصراً تحریر کریں۔

حصہ سوم

10. عہد وسطیٰ میں ریاست اور کلیسا کے مابین اقتدار کی کشمکش کا تفصیلی جائزہ لیں، اور بتائیں کہ پاپائیت کے عروج و زوال نے یورپی سیاست کو کس طرح متاثر کیا؟
11. جاگیردارانہ نظام کی ابتدا، اس کی نمایاں خصوصیات، اور چودھویں صدی کے بحرانوں (طاعونِ عظیم اور کسانوں کی بغاوتیں) کے نتیجے میں اس کے زوال کے اسباب پر ایک جامع مضمون تحریر کریں۔

اہم نکات